RC Bd. L. NO.7243

Phone 8808

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

فروری 1981

اس پرچہ میں :-

حسن کردار کا نقش تابندہ
(قائد اعظمؒ)

اگلے پرچہ میں :-

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ..... -/۳۶ روپے
غیر ممالک ..... -/۴ پونڈ

۸۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

جلد ۳۴ | فروری ۱۹۸۱ء | شمارہ ۲

فہرست

۱۔ نورِ مصطفیٰ ۲
۲۔ لمعات ۳
۳۔ قرآنی درس کے اعلانات ۴
۴۔ مسوّدہ قوانین متعلقہ قصاص (وغیرہ) پر تبصرہ ۵
۵۔ نقد و نظر (آہنگِ بازگشت) ۱۵
۶۔ اسلام کی مالیاتی اور محصولاتی معیشت (بین الاقوامی سیمینار) ۱۷
(محترم وزیر مالیات کا استقبالیہ اور صدر مملکت کا افتتاحی خطاب)
۷۔ فہرست معطیانِ فرانک ایجوکیشن سوسائٹی ۳۲
۸۔ حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح) ..... (محترم پرویز صاحب) ۳۳

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت، ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ۔ لاہور

هر کجا بینی جهانِ رنگ و بو
آنکه از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اورا بهاست
یا هنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پرویز صاحب کا معمول ہے کہ وہ عید میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر خصوصی خطاب پیش کیا کرتے ہیں۔ امسال انہوں نے ۲۳ جنوری کی صبح (اپنے ہفتہ واری درس کے بجائے) جو خطاب پیش کیا اس کا عنوان تھا ـــــ دنیا نظامِ محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے ـــــ اس میں انہوں نے بتایا کہ اقوامِ عالم کس طرح انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے معاشرت، سیاست، معیشت کی ناکامیوں کے بعد اس نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جسے وحیٔ خداوندی نے متعین کیا تھا اور جو سب سے پہلے حضورؐ نبی اکرم کے مقدس ہاتھوں وجود میں آیا تھا۔ فکرِ انسانی میں اس قسم کی تبدیلی کی ایک مثال خود پاکستان میں ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ حکومتِ پاکستان کی اقتصادی کمیٹی کی رپورٹ پر تبصرہ طلوعِ اسلام کی جنوری ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد جنوری ہی میں منعقدہ اقتصادی سیمینار میں محترم وزیرِ اقتصادیات کے استقبالیہ اور صدرِ مملکت کے افتتاحی خطاب میں جو کچھ کہا گیا ہے (اور جو چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آئے گا) وہ اسی فکری انقلاب کی شہادت پیش کرتے ہیں جس کی رُو سے قرآنی نظام کو اپنا منتہیٰ اور مقصود قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی آواز جس گوشے سے بھی اُٹھے ہم اسے مستحق مبارک باد سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم نے ان اربابِ اقتدار کو بھی درخورِ تبریک و تہنیت قرار دیا ہے۔

لیکن فکری انقلاب اسی صورت میں بامعنی ہو سکتا ہے جب اس کے مطابق عملی قدم اٹھایا جائے۔ قرآنی نظام کے لئے اس عملی اقدام کی ابتدا کس طرح خود سربراہِ مملکت کی طرف سے ہوتی ہے اس کی تفصیل پرویز صاحب نے اپنے اس مقالہ میں پیش کی جو روزنامہ نوائے وقت کی ۱۹ جنوری کی اشاعت میں شائع ہوا۔ وہ مقالہ بڑا فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے۔ اسے ہم پرویز صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔

حکومتِ پاکستان کی طرف سے پہلے "صدقہ" اور زکوٰۃ سے متعلق قوانین صادر اور نافذ ہوئے تھے۔ اب (جرمِ قتل کے ضمن میں) قصاص اور دیت وغیرہ سے متعلق قوانین کا مسودہ شائع کیا گیا ہے جس پر ہمارا تبصرہ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ فقہی قوانین ہیں جو صدیوں پہلے کے زمانے کے تقاضوں کے پیشِ نظر مرتب کئے گئے تھے انہیں ابدی طور پر نافذ رہنے والے اسلامی قوانین قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ اس کے کہ یہ قوانین موجودہ زمانے میں ناممکن العمل ہیں، ان سے ایک بڑا نقصان پہنچ رہا ہے کہ ہماری نوجوان نسل، جو مروجہ اسلام سے برگشتہ ہوتی جا رہی ہے، ان قوانین کو دیکھ کر اس سے متنفر ہو رہی ہے۔ ہمارا واسطہ ان نوجوانوں سے اکثر رہتا ہے۔ وہ جب مروجہ اسلام پر اعتراض کرتے تو ہم انہیں سمجھاتے تھے کہ یہ قدیم زمانے کے وضع کردہ عقائد اور قوانین ہیں حقیقی اسلام نہیں ہے۔ لیکن اب جو جدید "اسلامی" قوانین ان کے سامنے آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو قدیم زمانے کے وضع کردہ نہیں۔ یہ تو "کتاب و سنّت" کے مطابق موجودہ حکومت کے مرتب کردہ ہیں۔ اگر یہ بھی اسلامی نہیں تو پھر اسلامی قوانین کونسے ہوں گے؟ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد وہ نفسِ اسلام سے سرکش ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بہت بڑا علمی نقصان ہے۔

۲۔ پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ اخبارات میں یہ انہونی خبر شائع ہوئی کہ پاکستان میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ لوگ "اسلامی نظام" چاہتے ہیں یا نہیں، ریفرنڈم کرایا جائے گا! بے ساختہ دل سے یہ خیال اُبھرا کہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ بڑے خوش قسمت تھے جو پہلے ہی دنیا سے چلے گئے اور انہیں یہ دن دیکھنے نہ پڑے۔ سردست اس سے زیادہ کچھ کہنے کے لئے نہ وقت ہے نہ گنجائش۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزمہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈرز کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :- (نوٹ:- ہر بزم پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لیتے جاتے ہیں۔)
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد واپڈا سب سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۱ بجے دن	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE. #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۱	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ نمبر ۲۲ ہارون چیمبرز۔ الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ فون ۲۲۳۸۸۲۸
پشاور	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIR MAINGATE) پشاور سٹیڈیم بازار روڈ۔ فون ۷۲۶۵۹
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ آکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	جی۔ ۱۶۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز مغرب	رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ سرکلر روڈ
ایبٹ آباد	ہر اتوار ۴ بجے شام	دفتر غلام مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی مکان نمبر ۳۔ نظامی منزل
بہاولپور (۱)	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ، رفیق پور } باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب
بہاولپور (۲)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	رہائش گاہ اعظم منزل۔ مچھلی بازار } باہتمام ڈاکٹر (ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، تونگی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	دفتر بزم ملحق رہائشگاہ :- چوہدری مقبول شوکت، گل روڈ، سول لائنز
گجرات (۱)	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ
گجرات (۲)	ہر اتوار ۳ بجے سہ پہر	بمقام ۱۲/۱/بی بھمبر روڈ
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۳۱۰۷۱)
پنجگئی (تحصیل کبیر والا ضلع ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۲۷)
فیصل آباد	ہر جمعہ ۵ بجے شام	بمقام۔ حیات سرجیکل کلینک ۲۳/۲ پیپلز کالونی نمبر ۱ (فون ۲۷۳۵۵)

مسوّدہ قوانین متعلقہ قصاص (وغیرہ) پر

تبصرہ

طلوعِ اسلام کی طرف سے اس تبصرہ کو چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، کی خدمت میں بھیجا گیا ہے

حکومتِ پاکستان، قصاص اور دیت (قتلِ جرم وغیرہ کی سزاؤں) کے سلسلہ میں جدید قوانین نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ان مجوزہ قوانین کا مسوّدہ عام تنقید و تبصرہ کے لئے شائع کیا ہے۔ وہ مسوّدہ اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔

عام ملکی (سیکولر) قوانین کی تدوین و تنقید کا مسئلہ چنداں مشکل نہیں ہوتا۔ انہیں صرف ملکی اور عوامی مفاد کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن جن قوانین کو اسلامی یا شرعی حیثیت سے نافذ کرنا مقصود ہو، ان کی تدوین اور ان پر تنقید و تبصرہ کا سوال بڑا اہم اور نازک ہوتا ہے۔ ان کے لئے تو متعلقہ افراد کو خدا کے ہاں جوابدہ ہونا پڑتا ہے، اس لئے یہ ذمہ داری بڑی عظیم ہوتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ذمہ داری کا یہی احساس تھا جس کی بنا پر (جیسا کہ کہا جاتا ہے) امام اعظمؒ (ابوحنیفہ) نے کوڑے کھانے منظور کر لئے تھے، منصبِ قضا قبول نہیں کیا تھا۔ ہم اس سلسلہ میں جو کچھ عرض کریں گے اسی ذمہ داری کے پیشِ نظر کریں گے کہ ہم اس کے لئے خدا کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ وبیدہ التوفیق۔

کتاب و سنّت کے حوالے

(۱) مسوّدہ کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ مروّجہ قوانین میں اس انداز سے ترمیم کی جائے کہ وہ قرآن و سنّت کے مطابق ہو جائیں۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوئی کہ سارے مسوّدہ میں (جو ۱۲۳ شقوں پر مشتمل ہے) نہ قرآن کریم کی کسی ایک آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، نہ ہی کوئی حدیث درج کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ واضعینِ قوانین کے نزدیک نہیں اس کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنی تجاویز کی تائید میں قرآن و سنت کے حوالے پیش کریں۔ یہ تو بہت بڑا مقام ہے جسے یہ حضرات اپنے لئے تجویز فرما رہے ہیں۔

(۲) اس باب میں تو دو آرا نہیں ہو سکتیں کہ واضعینِ قوانینِ اسلامی کے لئے کچھ بنیادی خصوصیات اور شرائط ضروری ہیں۔ ان قوانین کی رُو سے گواہوں کے لئے بھی "تزکیۃ الشہود" کی شرط لازمی قرار دی گئی ہے۔ یعنی ان

کی زندگی پاکبازہو اور وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ خود فقہ میں قضاۃ کے انتخاب کے لئے بھی کچھ شرائط اور صفات ضروری قرار دی گئی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قوم کو اس باب میں مطمئن کرانا ضروری ہے کہ مجوزہ قوانین کے واضعین کم از کم ان شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ قوانینِ شریعت کی تدوین کی ذمہ داری ہر کہ ومہ کے سپرد نہیں کی جاسکتی۔ ان قوانین کے اثرات کا سلسلہ تو آخری زندگی تک چلا جاتا ہے۔

قوانین کی حیثیت

(۳) اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو "قوانینِ شریعت" منظور اور نافذ کئے جائیں گے، کیا ان کی اطاعت "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت اور ان کی خلاف ورزی، خدا اور رسولؐ کی معصیت متصور ہوگی، یا ان کی حیثیت عام ملکی قوانین جیسی ہوگی؟

(۴) مسودہ کی تمہید میں بتایا گیا ہے کہ ان تجاویز کا مقصد، مروجہ قوانین میں قرآن و سنت کے مطابق ترمیم کرنا ہے۔ لیکن مسودہ میں نئے قوانین بھی شامل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ نئے شرعی قوانین وضع کرنے کا حق یا اختیار کسے حاصل ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا اختیار اسلامی حکومت ہی کو ہو سکتا ہے۔

کفر و اسلام میں خطِ امتیاز

(۵) اللہ تعالیٰ نے اسلامی اور غیر اسلامی (بلکہ اسلام اور کفر) میں خطِ امتیاز یہ کہہ کر خود ہی کھینچ دیا ہے کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔

یعنی جو کچھ قرآن مجید کے مطابق ہے وہ اسلامی ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں، وہ غیر اسلامی (کافرانہ) ہے۔ یہ خدا کا مقرر کردہ وہ معیار ہے جس کے مطابق ہر ادارہ، ہر نظام، ہر قانون کو پرکھنا چاہیئے۔ ہم زیرِ نظر قوانین کا جائزہ اسی معیارِ خداوندی کی رُو سے لیں گے۔

قصاص کا مفہوم

(۶) **قصاص**:- ان قوانین کا بنیادی نقطہ قصاص ہے۔ مسودہ میں قصاص کا مفہوم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:-

> قصاص سے مراد ہے مجرم کے جسم پر اس جگہ، اسی قسم کی ضرب لگا کر سزا دینا جیسی ضرب اس نے مضروب کے جسم کے اس حصے پر لگائی تھی۔ یا اگر مجرم نے قتلِ عمد کا ارتکاب کیا تھا تو ولی یا اولیاء کا حق استعمال کرتے ہوئے مجرم کو بطور سزا ہلاک کرنا۔

اس مفہوم میں کئی ایک اسقام ہیں۔ قصاص کسی سزا کا نام نہیں۔ اس لفظ کے بنیادی معنی "کسی کا پیچھا کرنے" کے ہیں۔ اصطلاحی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم کا اس طرح پیچھا کیا جائے کہ وہ مؤاخذہ سے بچ نہ سکے۔ مؤاخذہ کے بعد اگر وہ مجرم ثابت ہو تو اسے جرم کے مطابق قانونی سزا دی جائے۔ اگر جرم ثابت نہ ہو تو اسے بری قرار دے دیا جائے۔

(ب) قصاص کا جو مفہوم مسودہ میں بتایا گیا ہے (کہ مجرم کے جسم پر اس جگہ، اسی قسم کی ضرب لگا کر سزا دینا جیسی ضرب اس نے مضروب کے جسم کے اس حصے پر لگائی تھی)۔ اس سے سزا کی بعض ایسی شکلوں کا تصور سامنے آتا ہے جن کے اظہار سے قلم رُکتا ہے۔ قصاص بالمثل سے متعلق ہماری کتب فقہ اور تفاسیر میں جو بحثیں مذکور ہیں ان کے تذکرہ سے حجاب مانع ہے۔ مسودہ میں یہ تصور درحقیقت اس قانون سے لیا گیا ہے جو یہودیوں کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ یعنی

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ..... (۵/۴۵)

اور ہم نے یہودیوں کے لئے تورات میں یہ حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ ناک کے بدلے ناک۔ کان کے بدلے کان۔ دانت کے بدلے دانت۔ اور زخموں کا مناسب قصاص۔

ہمارے لئے اللہ تعالیٰ نے جرم قتل کی سزا کے طور پر جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے۔ باقی (آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ کا) کا حکم کہیں نہیں دیا گیا۔ وہ یہودیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس لئے "مجرم کے جسم پر اس جگہ اسی قسم کی ضرب لگا کر سزا دینا جیسی ضرب اس نے مضروب کے جسم کے اس حصے پر لگائی تھی" قرآنی حکم نہیں۔ ضربات کے لئے اسلامی حکومت، حالات کے مطابق خود مناسب سزائیں مقرر کر سکتی ہے۔

(ج) جرم قتلِ عمد کے قصاص کو مقتول کے "ولی یا اولیاء" کا حق بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے، جرائم کا قصاص، حکومت کی ذمہ داری ہے، نہ کہ متاثرہ افراد کا حق، قرآن کریم نے جو کہا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ۔ (۲/۱۷۸)

قصاص کی ذمہ داری

"اے جماعتِ مومنین! تم پر جرائم کا قصاص واجب قرار دیا گیا ہے۔" یہ حکم پوری کی پوری اُمت کو دیا گیا ہے۔ جس کی تعمیل، حکومت کا فریضہ ہے۔

"حکومت کی ذمہ داری" اور مقتول کے "ولی یا اولیاء کے حق" میں کس قدر بنیادی فرق ہے اس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔ مسودہ کی رو سے

قتل کے مقدمہ میں، ولی یا اولیاء سے مراد مقتول کا (اس کے پرسنل لاء کے مطابق) وارث، یا ورثاء ہوں گے۔ اگر اس کا کوئی وارث نہیں ہوگا تو پھر اس کی ولی حکومت ہوگی۔

---

(۷) چونکہ ان قوانین میں بنیادی حیثیت جرم قتل کو حاصل ہے اس لئے ہم سب سے پہلے اس مسئلہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

جرمِ قتل

(ا) قرآن کریم میں سب سے پہلے یہ اصول دیا گیا کہ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ..... (۱۷/۳۳)

اللہ تعالیٰ نے ہر انسانی جان کو واجب الاحترام قرار دیا اور اُسے مارنا حرام ٹھہرایا ہے۔

انسانی جان کو صرف اِلحق۔ یعنی قانونِ خداوندی کی رو سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔
الحق (قانونِ خداوندی) کے خلاف، انسانی جان کا اتلاف جرمِ قتل ہے، خواہ یہ افراد کی طرف سے اور خواہ حکومت کی طرف سے۔ اس کے بعد ہے:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۖ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (۱۷/۳۳)

جو شخص ناحق مارا جائے تو (قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ مقتول کے وارثوں کا کوئی حامی اور مددگار نہیں اس لئے مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے) مقتول کے وارثوں کے لئے ہم نے (اسلامی حکومت کو) صاحبِ غلبہ و اقتدار بنایا ہے۔ اس لئے یہ حکومت قاتل کا مؤاخذہ کرے گی۔ لیکن حکومت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مجرم کو سزا قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دے۔ اس سے تجاوز نہ کرے۔ (۶/۱۵۲)

اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر مقتول یا اس کے وارث کمزور ہیں تو قاتل یہ نہ سمجھ لے کہ اس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ یا مقتول کے وارث اگر طاقتور ہیں تو وہ خود قاتل سے بدلہ لے لیں۔ قاتل کو تو بالحق سزا ملے گی اور یہ حکومت ہی کی طرف سے دی جائے گی۔ کیونکہ (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) مجرم کا مؤاخذہ کرنا (قصاص) اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ مقتول کے وارثوں کو نہ قاتل سے خود بدلہ لینے کا حق ہے اور نہ قصاص سے دستبردار ہونے کا اختیار۔ مملکت کے ہر متنفس کی جان کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسی لئے قصاص کو حکومت پر واجب قرار دیا گیا ہے۔ اس میں مقتول کے وارثوں کی مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ورثاء متوفی کے ترکہ کے وارث ہوتے ہیں، اس کی جان کے نہیں۔

قتلِ خطا

(۲) قرآن کریم نے قتل کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ قتلِ خطا اور قتلِ عمد۔ اور دونوں کے متعلق بڑی صراحت سے احکام دیئے گئے ہیں۔ پہلے کہا:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۚ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۴/۹۲)

کسی مومن کے لئے یہ روا نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے، اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔ اگر کسی کے ہاتھوں کوئی مومن غلطی سے مارا جائے تو وہ اس کے بدلے میں، ایک مومن غلام آزاد کرے۔ نیز مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دے (۴/۹۲) اگر وہ خون بہا معاف کر دیں تو پھر اور بات ہے۔
لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی قوم تم سے برسرِ پیکار ہے اور ان میں کوئی مومن مرد ہے جو تمہارے ہاتھوں غلطی سے مارا

جاتا ہے، تو اس کے کفارہ کے طور پر ایک مومن غلام آزاد کیا جائے گا۔ (خون بہا نہیں دیا جائے گا کیونکہ تم خون بہا دو گے وہ تو تم سے جنگ کر رہے ہیں)۔ لیکن اگر وہ شخص اس قوم سے ہو جس کے ساتھ تمہارا معاہدۂ صلح ہے تو اس صورت میں اس کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہوگا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا بھی۔ لیکن اگر قاتل کے پاس غلام آزاد کرنے کی مقدرت نہ ہو یا ایسی صورت ہو کہ غلام ملے ہی نہیں تو وہ دو مہینے کے متواتر روزے رکھے۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رُو سے عفوِ خطا کا موجب بن جائے گی، اس قانونِ خداوندی کی رُو سے جو سرتاسر علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اس ارشادِ خداوندی کی رُو سے واضح ہے کہ قتلِ خطا کی سزا صرف دیت (خون بہا) ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس کے بعد قتلِ عمد آتا ہے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے:۔

قتلِ عمد

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔ (۴/۹۳)

اگر کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو (قتلِ ناحق کی سزا موت تو ہو گی ہی) مرنے کے بعد بھی وہ جہنم میں جائے گا جہاں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہوگی۔ اور عذابِ عظیم۔

ان دونوں آیات کے تقابل سے واضح ہے کہ دیت (خون بہا) صرف قتلِ خطا میں ہے قتلِ عمد میں نہیں۔ اگر ہر قسم کے قتل میں دیت جائز ہوتی تو اُسے قتلِ خطا کے ساتھ مختص نہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں اس آیت کو سامنے لائیے جس میں قصاص کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ یوں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ.... (۲/۱۷۸)

اے جماعتِ مومنین! تم پر فرض قرار دیا جاتا ہے کہ تم قتل کے مجرم کا تعاقب کر کے اسے قانون کے مطابق سزا دو (بالفاظِ دیگر، اسے قاتل اور مقتول کے وارثوں کے مابین نجی معاملہ نہ سمجھا جائے بلکہ اسے معاشرہ یا نظام کے خلاف جرم سمجھا جائے۔ یہ نظام اسے اپنے ہاتھ میں لے)۔

سزا کے سلسلہ میں، عدل اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ یعنی اس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں ہوگی۔ سوال مقتول یا قاتل کی پوزیشن کا نہیں۔ اصل سوال تقاضائے عدل کا ہے جس کی رُو سے ہر انسانی جان یکساں قیمت رکھتی ہے ـــــ (مثلاً) اگر قاتل آزاد مرد ہے تو وہی آزاد مرد سزا پائے گا۔ اگر قاتل غلام ہے تو اسی غلام کو سزا دی جائے گی۔ اگر وہ عورت ہے تو اس کا عورت ہونا اسے سزا سے نہیں بچا سکے گا، اسے بھی سزا بھگتنی پڑیگی۔

اس کے بعد آیت کا بقیہ حصہ) یہ ہے:۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ

اَلِيْمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (۲/۱۷۸-۱۷۹)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے :۔

پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ تو تابعداری کرنی چاہیئے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیئے اس کو خوبی کے ساتھ۔ یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی۔ پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے عذاب ہے دردناک اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو! تاکہ تم بچتے رہو۔

(ترجمہ۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ قتلِ عمد میں بھی دیت لی جا سکتی ہے اور مقتول کے وارث قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ہر دو استنباطات قرآن کے خلاف ہیں۔

پہلے دیت کو لیجئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے دیت کو صرف قتلِ خطا کی صورت میں روا رکھا ہے۔ اگر دیت ہر قسم کے قتل میں روا ہوتی تو اسے قتلِ خطا کے ساتھ کیوں مختص کیا جاتا ۔۔۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ، درحقیقت آیۂ قتلِ خطا (۴/۹۲) کے الفاظ : اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا کی تعبیر ہیں۔ آیت (۲/۱۷۸) میں اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کا تعلق قتلِ عمد سے ہے۔ اور فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ ...... الآخر کا تعلق قتلِ خطا سے۔ قرآن کریم کی تصریفِ آیات کی رو سے اپنے احکام کی تشریح اسی انداز سے کیا کرتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ مقتول کے وارث، قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں، تو یہ اس لئے غلط ہے کہ قرآن کریم نے قتل کو حکومت کے خلاف جرم قرار دیا ہے اور اسی کو اس کے مؤاخذہ (قصاص) کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، قاتل سے بدلہ لینا، مقتول کے وارثوں کا حق نہیں کہ اگر وہ چاہیں تو بدلہ لے لیں اور چاہیں تو معاف کر دیں۔ انہیں اس کا حق دینے سے جرمِ قتل کے ارتکاب کے کس طرح چاٹک کھل جاتے ہیں۔ اس کے متعلق بعد میں لکھا جائے گا۔ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ میں "شَيْءٌ" اور "اَدَآءٌ" کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ ان کا تعلق مال یعنی دیت سے ہے۔ انسانی جان سے نہیں۔ اور دیت کی اجازت صرف قتلِ خطا میں ہے۔ لہٰذا، قتلِ عمد میں نہ دیت لی جا سکتی ہے نہ قاتل کو معاف کیا جا سکتا ہے۔

---(o)---

یہ ہیں جرمِ قتل کے قصاص کے قرآنی احکام۔ اب مسودہ قوانین کی طرف آیئے۔

شبہ العمد

قرآن کریم میں قتل کی دو ہی اقسام کا ذکر ہے۔ قتلِ عمد اور قتلِ خطا۔ لیکن مسودہ میں ان کے علاوہ ایک اور شق بھی ہے۔ یعنی شبہ العمد۔

قتلِ عمد میں اگر قاتل کی نیت (INTENTION) خود ہی محسوس طور پر نمایاں نہ ہو جائے تو اس کا معلوم یا متعین کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عمد (ارادہ یا نیت) کا تعلق انسان کے داخلی جذبات

سے ہوتا ہے جن تک خارجی آنکھ کی رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ جب قتلِ عمد میں اثباتِ جرم میں اس قسم کی مشکلات پیش آنے کا امکان ہے تو قتل شبہ عمد میں یہ مشکلات اور بھی زیادہ ہوں گی۔ مسودہ میں قتل شبہ العمد کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

جو کوئی کسی دوسرے شخص کے جسم یا ذہن کو نقصان پہنچانے کی نیت سے، لیکن ہلاک کرنے کی نیت کے بغیر، کسی ایسے ہتھیار یا فعل سے، جس سے عام طور پر موت واقع نہیں ہوتی، اسے ہلاک کر بیٹھے گا تو اسے قتل شبہ العمد کا ارتکاب کہا جائے گا۔

یہ قتلِ خطا ہوگا۔ البتہ جو ضرب اس نے (نیت سے) لگائی ہے وہ الگ جُرم ہوگا۔

(۰)

(۸) اب آیئے جرم قتلِ عمد کی سزا کی طرف۔ ہم دیکھ چکے ہیں قتلِ عمد میں دیت نہیں اور اس میں مستغیث خود حکومت ہوتی ہے۔ لیکن مسودہ میں کہا گیا ہے کہ

(i) اس میں دیت بھی ہو سکتی ہے۔

(ii) مقتول کے ولی یا اولیاء کو حق حاصل ہوگا کہ قاتل کو بلا مشروط معاف کر دیں۔

(iii) یا اس کے ساتھ سودا کر کے اس سے صلح کر لیں۔ اس سے معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

یہ تینوں شکلیں قرآن کریم کے احکام کے صریحاً خلاف ہیں۔ اور ان سے جرم قتل کے ارتکاب کے پھاٹک کھل جائیں گے۔ یہ روزمرّہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ قتل کے بیشتر محرکات جائدادوں کی وراثت ہوتی ہے یا بدقماش عورتیں، اپنے آشناؤں سے مل کر اپنے خاوندوں کو قتل کرا دیتی ہیں۔ کہا جائے گا کہ قانون کی رُو سے، قاتل، مقتول کی جائداد کا وارث نہیں ہو سکے گا۔ لیکن جو لوگ جائدادوں کے وارث بننے کے لئے قتل کراتے ہیں، وہ خود قتل نہیں کرتے۔ قاتل کرائے پر لئے جاتے ہیں۔ یہی صورت بدقماش عورتوں کی ہوتی ہے۔ موجودہ حالات میں، کرائے کے قاتلوں کو سزائے موت کا خطرہ لاحق ہوتا ہے لیکن جب مقتول کے وارثوں کو، جنہوں نے قتل کرایا تھا، معاف کر دینے کا حق حاصل ہو تو کرائے کے قاتل بلا تکلف مل جائیں گے۔ اگر قاتل کو دیت بھی ادا کرنی ہوگی تو وہ بھی مقتول کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ وہ خود ہی قاتل کے ہاتھوں دیت ادا کر دیں گے۔ اور پھر خود ہی اسے وصول کر لیں گے۔ علاوہ ازیں کمزور پارٹیوں کو صلح کے لئے مجبور کرنے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے؟ اس وقت تو ان کے پاس یہ عذر ہوتا ہے کہ قانون کی رُو سے صلح کی گنجائش نہیں۔ جب قانون اس کی اجازت دے دے گا تو وہ صلح کے لئے بآسانی مجبور کئے جا سکیں گے۔

غور فرمایئے کہ کیا اس سے جرم قتلِ عمد کے ارتکاب کے پھاٹک نہیں کھل جائیں گے۔ قرآن کریم نے جو قتلِ عمد میں نہ دیت کی گنجائش رکھی تھی، اور نہ ہی عفو یا صلح کی، تو اس سے مقصود یہ تھا کہ اس جرم کے ارتکاب کے امکانات ختم نہیں تو بڑی حد تک کم ہو جائیں۔ مجوزہ قانون قرآنِ کریم کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔

(۹) دیت کی قیمت (رقم) کے تعین کے سلسلہ میں (i) دس ہزار درہم شرعی۔ اور (ii) ایک ہزار

درہم و دینار شرعی

دینار شرعی کہا گیا ہے۔ کھرے اور کھوٹے سکوں کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکی کہ سکے بھی شرعی اور غیر شرعی ہوتے ہیں؟ پھر پاکستان میں رقوم کا تعین درہم اور دینار میں کرنا، عجیب سا نظر آتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان قوانین کے واضعین کے سامنے فقہ کی کتابیں ہیں۔ جو الفاظ ان کتابوں میں لکھے ملتے ہیں، انہوں نے انہی کو نقل کر دیا ہے۔ مسودہ میں استعمال شدہ تمام اصطلاحات کی یہی کیفیت ہے۔ (مثلاً) ارش۔ ضمان۔ عاقلہ۔ غیر معصوم۔ غیر معصوم الدم۔ شجہ۔ جرح۔ شجہ خفیفہ۔ شجہ موضحہ۔ شجہ ہاشمہ۔ شجہ منقلہ۔ دامغہ۔ باضعہ۔ متلاحمہ۔ وغیرہ۔ چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل (جسٹس تنزیل الرحمٰن) نے اگلے دنوں ایک تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ پاکستان قانون کی زبان اردو ہونی چاہیئے۔ مروجہ اردو زبان میں تو اس قسم کی اصطلاحات کہیں نظر نہیں آتیں۔

عورت کی دیت

(۱۰) اب ایک ایسی شق کی طرف آیئے جسے دیکھ کر یقین مانیئے ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ کہا ہے:-

اگر مقتولہ عورت ہوگی تو اس کی دیت، مردوں کی دیت سے آدھی ہوگی!

یا اللہ! عورت کی جان کی قیمت، مرد کی جان کی قیمت سے نصف! ایسے قوانین وضع کر کے ہم خدا کے حضور کس منہ سے جائیں گے، اسے تو چھوڑیئے۔ ہم تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے ہم دنیا کو کیا منہ دکھائیں گے، بالخصوص جب ان قوانین کو اسلامی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔

اس کی سند اور دلیل اس کے سوا کیا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ قرآن تو انسانی نفس (جان) اور نفس (جان) میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اور عورت بھی بالآخر انسان ہی ہوتی ہے۔

عاقلہ

(۱۱) بعض صورتوں میں دیت یا ارش کی رقم مجرم کی عاقلہ کو ادا کرنی ہوگی۔ مسودہ کی رُو سے عاقلہ سے مراد ہے کسی گروہ، افراد کی جماعت، انجمن، ادارے، تنظیم، کمیٹی، کارپوریشن، اسٹیبلشمنٹ، محکمے، ٹریڈ یونین، منظم قبیلے یا برادری، کے تمام مرد، بالغ اور عاقل ارکان، جن سے مجرم یا سزا یافتہ شخص مدد یا حمایت حاصل کرتا ہو، یا حاصل کرنے کی امید رکھتا ہو۔

ان سے بھی دیت وصول کی جا سکے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۵۳/۳۸) کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ جرم کی سزا صرف مجرم کو ملے گی۔

اثباتِ جرم

(۱۲) قتلِ عمد کے جرم کے اثبات کے لئے خود مجرم کا اقبالِ جرم۔ یا کم از کم دو مسلمان مرد گواہ، جو تزکیۃ الشہود کی شرط پر پورے اتریں۔

(اگر ملزم غیر مسلم ہو تو گواہ بھی غیر مسلم ہونے چاہئیں)

یعنی:- اگر دو گواہ نہ ہوں، ایک ہی ہو۔ یا

ایک گواہ مسلمان اور ایک غیر مسلم ہو۔ یا

ایک گواہ مرد اور ایک عورت ہو۔ یا دونوں عورتیں ہوں۔ یا
گواہ تزکیۃ الشہود پر پورے نہ اتریں۔

تو جرم ثابت نہیں ہوگا۔ قتلِ عمد کا مجرم بری ہو جائے گا، خواہ اس جرم کے عینی شاہد بیس غیر مسلم اور پچاس عورتیں بھی کیوں نہ ہوں۔

اور اگر جرم ثابت بھی ہو جائے تو مقتول کے وارث اسے معاف بھی کر سکیں گے اور کچھ لے دے کر صلح بھی کر لیں گے۔ مقتول کے ورثاء کو تو اس کا پورا پورا اختیار ہوگا لیکن (مسودہ کی رو سے) کسی گورنر یا صدرِ مملکت کو سزا کی معافی یا تخفیف کا اختیار نہیں ہوگا۔ البتہ اگر مقتول کا کوئی وارث نہ ہو تو پھر حکومت اس کی وارث ہوگی اور اسے وارث کے جملہ اختیارات حاصل ہوں گے۔

آپ نے غور کیا کہ ان قوانین کی رو سے عام حالات میں مقتول کے وارثوں کا مقام عدالتِ عالیہ اور حکومت سے بھی بلند رکھا ہے۔

(۱۳) مسودہ میں کہا گیا ہے:۔

قسامت ۱:۔ اگر قتل کا مرتکب مجرم نامعلوم ہو یا معقول تحقیقات کے بعد بھی اس کا پتہ نہ چلے تو جس محلے یا علاقے میں مقتول کی لاش پائی جائے یا جس محلے یا علاقے کے متعلق یہ کہا جائے یا جس محلے یا علاقے کا تعلق سے یہ ظاہر ہو کہ جرم وہاں وقوع پذیر ہوا تھا، اس محلے یا علاقے کے کسی ایک بالغ فرد یا افراد سے ولی یا اولیاء کے مطالبے پر، سماعتِ مقدمہ کی مجاز عدالت یا اس عدالت کے مجاز کردہ کسی عدالتی افسر کے روبرو مندرجہ ذیل صورت میں قسم لی جائے گی۔

(یہاں قسم کے الفاظ دیئے گئے ہیں کہ نہ میں نے قتل کیا ہے اور نہ ہی مجھے قاتل کے متعلق کچھ علم ہے۔)

جن لوگوں سے قسم لی جائے گی ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد پچاس ہوگی۔ اگر ان کی تعداد پوری پچاس تو ان میں سے ہر شخص ایک ایک بار قسم کھائے گا اور اگر پچاس سے کم ہو تو ان سے اتنی دفعہ قسم لی جائے گی کہ قسموں کی تعداد پوری پچاس ہو جائے۔

جو شخص قسم کھانے سے انکار کرے گا اسے حراست میں لے لیا جائے گا اور اس وقت تک قید سادہ میں رکھا جائے گا جب تک وہ قسم نہ کھائے یا ارتکابِ جرم کا اعتراف نہ کرے یا قاتل کے بارے میں مطلع نہ کرے۔

۳:۔ جب مذکورہ بالا قاعدہ کی رو سے قسم کھائی جائے تو عدالت مقدمہ کے کوائف کا لحاظ رکھتے ہوئے اس شخص یا اشخاص کا تعین کرے گی جو دیت کی ادائیگی کے ذمہ دار ہوں گے۔

قرآنِ کریم میں تو اس قسم کی کوئی صورت مذکور نہیں۔

(۱۴) ان مقدمات میں کوئی فریق چاہے تو ایڈووکیٹ کے ساتھ یا اس کی جگہ کسی عالم کو بھی پیش کر سکتا ہے۔ ایڈووکیٹ اور عالم کی ثنویت اس ایک مقام پر ہی نہیں۔ مسودہ کے مختلف مقامات پر کہا گیا ہے کہ اگر ایسا

ممکن نہ ہو تو موجودہ تعزیراتِ پاکستان کے مطابق عمل کر لیا جائے۔ یعنی اسلامی ضابطہ قوانین مرتب بھی کیا گیا تو ایسا کہ اس کے ساتھ موجودہ "غیر اسلامی" ضابطہ کی بھی ضرورت پڑے!

(۰)

حقِ شفعہ

دوسرا مسودہ "حقِ شفعہ" سے متعلق ہے۔ اس حق کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

حقِ شفعہ وہ حق ہے جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں جائداد غیر منقولہ کو بذریعہ بیع حاصل کرنے کا استحقاق رکھتا ہے۔

ہم اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے کیونکہ قرآن اس قسم کا استحقاق کسی کو نہیں دیتا۔ جب آپ کسی جائداد پر مالک کا حقِ ملکیت تسلیم کرتے ہیں تو پھر اس پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں لگا سکتے جس کی رُو سے وہ اپنی جائداد کو جس کے پاس چاہے فروخت نہ کر سکے۔ اپنی مصلحتوں کو وہ خود ہی بہتر سمجھتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمسایہ کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے، جس طرح والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کی ہے۔ ان سب کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔ (۴/۳۶) ہمسایہ کو کوئی خاص حق نہیں دیا۔ نہ ہی مسودہ قوانین میں اس حق کے لئے کوئی قرآنی سند پیش کی گئی ہے۔ اس قسم کے قوانین کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کو غلط طریقے اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اور باہمی عداوتیں اور مخاصمتیں بڑھیں۔

(۰)

ان مسودات میں ذیلی شقیں اور بھی بہت سی ہیں لیکن ہم نے اپنے تبصرہ کو انہی شقوں تک محدود رکھا ہے جو کسی نہ کسی جہت سے قرآنِ کریم کے احکام یا حدود سے ٹکراتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دعویٰ تو یہ کیا جاتا ہے کہ مروّجہ قوانین میں "قرآن و سنت" کے مطابق ترمیم کی جا رہی ہے لیکن درحقیقت قدیم قوانینِ فقہ کو جدید رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ فقہی قوانین جس زمانے میں مرتب ہوئے تھے، وہ اُس زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مرتب کئے گئے تھے۔ وہ ابدی طور پر اسلامی نہیں کہلا سکتے۔ ابدیت تو صرف قوانینِ خداوندی حاصل ہے۔ (لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ۔ (۶/۱۱۶)) فقہی قوانین چونکہ ہمارے زمانے کے تقاضے پورے کر نہیں سکتے تھے اس لئے وہ خود بخود غیر مؤثر ہوتے جا رہے تھے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ قوانین سازی ..... کی موجودہ کوششوں کا جذبہ محرکہ درحقیقت انہی قوانین کو از سرِ نو زندہ کرنا اور مؤثر بنانا ہے۔ لیکن اس قسم کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ "حدود" سے متعلق قوانین اس کی زندہ شہادت ہیں۔ اسلامی قوانین مرتب کرنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم کی ابدی اور غیر متبدل حدود و قیود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جدید قوانین وضع کئے جائیں۔ اس کے سوا اسلامی قوانین مرتب کرنے کا کوئی طریق نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

کوئی نظام ہو یا ضابطہ قوانین، اسے اسلامی اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اسے کتاب اللہ کی سند حاصل ہو۔ اقبالؔ کے الفاظ میں:۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(۰)

نقد و نظر

آہنگِ بازگشت

چھ سات سال اُدھر، جب مختار مسعود صاحب کی کتاب "آوازِ دوست" دیکھنے کا اتفاق ہوا تو جی خوش ہوا کہ غنیمت ہے ہماری (اُردو) زبان میں ایک نہایت خوشگوار اسلوبِ بیان کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے بعد (معلوم نہیں کیوں؟) نہ تو مسعود صاحب نے ہی دوبارہ آواز دی اور نہ ہی کسی اور طرف سے اس کی صدائے بازگشت سُننے میں آئی۔ اب جو زیرِ تبصرہ کتاب سامنے آئی تو سارے گلے تمام ہو گئے۔ شستہ و رفتہ، اور اس کے ساتھ شاداب اور شگفتہ۔ (غالبؔ کے الفاظ میں) سادگی و پرکاری اور اس میں مزاح کی لطافت و ملاحت۔ محض اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو یہ ایک منفرد صحیفہ نظر آئے گا۔ اور پھر بالکل غیر متوقع! غیر متوقع اس لئے کہ مصنف کا نام ہے "مولوی" محمد سعید۔ آپ سوچئے کہ کہاں "مولویت" اور کہاں یہ حسنِ لطیف! وہ "مولویت" جس کے متعلق فیضؔ نے کہا تھا کہ ؎

جنابِ شیخ سے مے کا جواز کیا پوچھیں کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

اور پھر مصنف نے ساری عمر صحافت کی وادیوں میں گذاری ہے (اور وہ بھی انگریزی جرائد میں جو بڑی "غیر ذی زرع" واقع ہوتی ہیں۔ ان قلمکاروں کی زندگی کمپیوٹر کی سی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس قسم کے میکانکی ماحول میں، زندگی کی حرارتوں اور نزاکتوں کو نہ صرف سنبھالے رکھنا بلکہ انہیں پروان چڑھانا ــــ کارِ ہر دیوانہ نیست۔ بعض لوگ واقعی "پوشیدہ ولی" ہوتے ہیں۔

یہ تو رہا مصنف کے متعلق۔ تصنیف کیا ہے؟ اس کا تعارف خود مصنف ان الفاظ میں کراتا ہے:۔

یہ چند اوراق جو پیشِ خدمت ہیں میں نے ساٹھ برس، ایک ماہ اور تین ہفتوں میں لکھے ہیں۔ یہ تحریر تاریخ نہیں، اس لئے کہ ہمارے ہاں تاریخ جن ایوانوں میں بنتی رہی ہے میں ان میں کبھی بار نہ پا سکا۔ یہ محض افسانہ بھی نہیں، اس لئے کہ یہ دن مجھ پر بیت چکے ہیں۔ یہ دن میری وجہ سے اہم نہیں تھے۔ میں ان کی اہمیت کا ایک ادنیٰ سا تماشائی تھا۔ اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ دن مجھ پر نہ گذرے ہوتے تو میں کتنا تہی دامن ہوتا!

اس اعتبار سے کہ مصنف نے اسے اُن واقعات کا مرقع کہا ہے جن پر وہ گزر چکے ہیں، اسے ان کی سوانح عمری کہا جا سکتا تھا لیکن ان خود نوشت سوانح میں "سوانح" اور "خود" کی نسبت کیا ہے، اس کا اندازہ ان تعارفات سے لگایا جا سکتا ہے جو ٹی۔ وی کے اسٹیج پر ہر شام سامنے آتے ہیں۔ تعارفی (اعلان کرنے والا آتا ہے (بالعموم آتی ہے) اور کہتا ہے:۔

ناظرین! شعر اور نغمہ کے امتزاج کی کیفیت یوں سمجھئے جیسے سورج کی کرنیں جب فضا میں بکھری ہوئی ونڈو میں سے گزرتی ہیں تو وسیع و عریض افق پر ہفت رنگ قوسِ قزح کی نمود ہو جاتی ہے۔ اس قوسِ قزح کی رنگینیاں ابھی آپ کے سامنے کیف بار ہوتی ہیں ــــ گلوکارہ ..... تشریف لاتی ہیں۔

اس کے بعد اعلان کرنے والے پردۂ سیمیں میں خود گم ہو جاتے ہیں اور شعر و نغمہ کا امتزاج سامنے آجاتا ہے۔

"آہنگِ بازگشت" کا سوانح نگار (یعنی مصنف) آنے والے واقعہ کا تعارف کرا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اس کے بعد

وہ واقعہ سامنے آجاتا ہے ــــ گاہے کیف و نشاط کا ہم آہنگ لگا ہے درد و داغ کا ہم نوا . . . . یہ سلسلہ تحریکِ خلافت (سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء) سے شروع ہو کر سقوطِ ڈھاکہ (سنہ ۱۹۷۱ء) تک اسی انداز اور رفتار سے چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے ہندو پاکستان کے اس دور کی گویا تاریخ کہا جا سکتا ہے جو ہماری حیاتِ ملی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ واقعات تو ایک صحافی کی زنبیل میں ڈھیروں ہوتے ہیں لیکن اصل بات ان کے انتخاب کی ہوتی ہے۔ اور سعید صاحب کے حسنِ انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ (چونکہ مصنف کی زندگی اخباری دنیا میں گزری ہے اس لئے ان واقعات میں بعض مقامات پر صحافتی پہلو زیادہ جھکا ہوا محسوس ہوتا ہے۔) اور پھر انہیں بیان ایسے دلکش انداز میں کیا گیا ہے کہ قاری ان میں محو ہو کر خود اپنے آپ کو ان کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ کتاب پڑھتے جایئے تو ایک ناول ہے لیکن ختم کیجئے تو آپ کے دامن میں پچاس سالہ تاریخ کی چیدہ چیدہ معلومات کا انبار لگا ملے گا ــــ اُس دامن میں جو اس دوران میں غیر شعوری طور پر آپ کے آنسوؤں سے بھیگ چکا ہو گا۔ اگر ہمت ہو تو آخری صفحہ کی ان چند سطروں کو دل تھام کر پڑھنے کی کوشش کیجئے۔

ایامِ تقسیم میں امرتسر اور جالندھر کے درمیانی علاقے میں کام کرنے والا ایک انگریز بریگیڈیئر آر۔ سی۔ بی برسٹولیوں قمطراز ہے:۔

"اپنی گشت کے دوران ایک سڑک کے کنارے میں نے دیکھا کہ ۱۲۰ مسلمان عورتوں کے لاشے پڑے ہیں۔ لباس سب کے اترے ہوئے ہیں۔ وہ حملہ آور جو اُن کی جان اور عصمت کے دشمن تھے، ہر وحشت سے فارغ ہو کر جا چکے تھے۔ یہ لاشے اُن کے لئے مزید کسی کام کے نہیں تھے۔ میں نے ان میں سے ایک میں زندگی کی رمق محسوس کی۔ ذرا آگے بڑھا۔ وہ خاتون غیر شعوری طور پر جھٹکے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنی شلوار کو گھٹنوں تک کھینچ لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پھر لیٹ گئی۔ میں بات کرنے کے لئے جھکا۔ وہ بھی دم دے چکی تھی۔ لاشوں کے اس ہجوم میں کچھ بچے رو رہے تھے اور اپنی اپنی ماؤں کی چھاتیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر رینگ رہے تھے۔"

وقت نے تھم کر اس لمحے پوچھا: "بِاَیِّ ذَنۡۢبٍ قُتِلَتۡ" (تو کس گناہ کی پاداش میں ماری گئی) اور نہ آج ڈھاکے اور چٹاگانگ کے ذبح خانوں میں ذبح ہونے والے خوش لباس جوانوں کو دیکھ کے کہا۔ ؎

زایں داد خواہ کیست؟

سعید صاحب! ہم آپ کو مستحق تبریک و تہنیت سمجھتے ہیں کہ آپ نے اس قرضہ کو جو قوم کے ذمے چلا آ رہا تھا، (سارے کا سارا نہیں تو کم از کم اس کی ایک قسط کو) بحسن و خوبی ادا کر دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ سے ایک گلہ بھی ہے کہ آپ نے اس سفر میں ہمیں اس ویرانے میں لا کر تنہا چھوڑ دیا ہے جہاں آپ کی ہم قدمی کی بڑی ضرورت تھی۔ یعنی سنہ ۱۹۷۱ء کے بعد کے واقعات کی۔ ہماری درخواست ہے کہ آپ اس داستان کے باقیماندہ حصّہ کو سردست محفوظ ضرور کر دیجئے۔ یہ بڑے کام کی چیز ہو گی۔

کتاب میں فہرست کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں اسے پورا کر دیجئے۔ کتاب تو مصنف کے لئے بمنزلہ اولاد کے ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کے نام نہ رکھئے، پھر دیکھئے گھر میں تماشا کیا ہوتا ہے؟ یہی کیفیت قاری کی فہرست کے بغیر ہوتی ہے۔

قریب پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب، طباعت، کتابت اور تجلید کے لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہے۔ اور صرف پینتیس روپے میں، خود مصنف سے (۹۔ڈی۔ سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی کے پتہ سے) مل سکتی ہے۔

اسلام کی مالیاتی اور محصولاتی معیشت

(بین الاقوامی سیمینار)

حکومتِ پاکستان کے زیر اہتمام ۶ تا ۱۰ جنوری ۱۹۸۱ء، اسلام آباد میں ایک بین اقوامی سیمینار منعقد ہوا جس میں مختلف مسلم ممالک کے، اقتصادیات کے شہرۂ آفاق ماہرین نے شرکت کی۔ فیڈرل حکومتِ پاکستان کے وزیر مالیات، محترم غلام اسحاق خان صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پیش فرمایا اور اس کے بعد، صدرِ مملکت پاکستان، جنرل ضیاء الحق کے خطاب سے اس کا افتتاح ہوا۔ چونکہ یہ استقبالیہ اور خطاب فی الجملہ اس پیغامِ خداوندی کی صدائے بازگشت ہیں جسے قرآن مجید چودہ سو سال سے اپنی دفتین میں محفوظ رکھنے اور جسے طلوعِ اسلام گزشتہ تیس (یا کم چالیس) سال سے ملت کے سامنے پیش کئے چلا آ رہا ہے، اس لئے ہم ان کے، بنیادی نکات پر مبنی اقتباسات، انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ، پیشِ خدمتِ قارئین کرتے ہیں۔ چونکہ آغازِ سخن استقبالیہ سے ہوا تھا اس لئے ابتداء اسی سے کی جاتی ہے۔ یہ انگریزی زبان میں ہے اس لئے ان اقتباسات کا رواں ترجمہ پیش کیا جائے گا، اور جہاں ہم دیکھیں گے کہ خالی ترجمہ سے بات واضح نہیں ہوئی، وہاں مفہوم درج کیا جائے گا۔ اور مختصر تبصرہ بھی۔

سیمینار کی اہمیت

خان صاحب موصوف نے سیمینار کی اہمیت کے سلسلہ میں فرمایا:-

> یہ سیمینار، اُن سیمیناروں کے لامتناہی سلسلہ کی ایک کڑی نہیں جو سال بھر (یہاں وہاں) اکثر منعقد ہوتے رہتے ہیں اور جن میں بین الاقوامی شہرت کے دانشور شرکت کرتے ہیں۔ (اس سیمینار کی حیثیت منفرد ہے) اس وقت امتِ مسلمہ احکاماتِ خداوندی کی روشنی میں اپنی تقدیر کی تشکیلِ نو کی جس جدوجہد میں مصروفِ عمل ہے، اسے اس کا نشانِ راہ سمجھنا چاہیئے۔ جو حضرات اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہیں، انہیں بجا طور پر اس پر فخر ہونا چاہیئے، وہ فخر و تازہ جو مقصد پیشِ نظر کی اہمیت اور وسعت کے احساس سے نیازمندی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ (ص۱)

اس سے آپ اس سیمینار کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ عصرِ حاضر کی خدا فراموش فضا میں اپنے مسائل کا حل، ارشاداتِ خداوندی کی راہ نمائی میں تلاش کرنے کا جذبہ اور عزم فی الواقعہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے خطہ کے حصول کا مقصد و منتہیٰ درحقیقت یہی تھا۔

اسلام - ایک مکمل ضابطہ حیات

قرآنی ماہ تمائی میں زندگی کے اہم مسائل کا جو حل متعین کیا جائے گا، اسے "اسلام" کہہ کر پکارا جائے گا۔ اسلام کے متعلق خان صاحب نے فرمایا:-

اسلام ایک مکمل، ہر اعتبار سے درست اور خود مکتفی، اور آئیڈیل ضابطہ حیات ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کی تمام جزئیات کی، اس ضابطہ حیات کے مطابق، از سرِ نو تعمیر کرنی ہے۔ اس سے آپ اپنے پیشِ نظر پروگرام کی اہمیت اور عالمگیریت کا اندازہ لگا لیجئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب ہم اپنی زندگی کی تعمیرِ نو کا پروگرام عملاً شروع کریں گے تو ہمیں اس کے مختلف اجزاء کو ایک ایک کر کے لینا ہوگا۔ لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ ایسا کرتے وقت ہم اسلامی نظامِ زندگی کی ہمہ گیریت اور کلیت (TOTALITY) اور اس کے ان بنیادی مقاصد کو نظر انداز نہ کریں جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸)

اے ایمان والو! تم نظامِ خداوندی میں پورے کے پورے (کلیتہً) داخل ہو جاؤ۔

اس کافۃً کی رو سے مسلمان کی پوری کی پوری زندگی ایک ہم آہنگ وحدت ہوتی ہے جسے نہ ٹکڑوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے نہ اس کے تسلسل میں انقطاع پیدا کیا جا سکتا۔ (وہ ایک غیر منقسم وحدت بھی ہوتی ہے اور ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل بھی)..... اس کا سلسلہ، اس دنیا کی زندگی سے آگے بڑھ کر اُخروی زندگی تک چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اس دنیا کے مادی مطالبات اور روحانی تقاضوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ نیز، ایک فرد کی نشوونما اور معاشرہ کا ارتقاء دوش بدوش آگے بڑھتا ہے۔ (صـ۲۰۳)

ثبات و تغیر کا امتزاج

اس کے بعد خان صاحب نے فرمایا ہے کہ اسلام میں ایک تو وہ اصول ہیں جو وحی کی رو سے عطا ہوتے ہیں، اور دوسرے وہ طریق جن کے ذریعے انسانی زندگی کے تقاضوں کو اُن اصولوں کی روشنی میں پورا کیا جاتا ہے۔

ان دونوں میں فرق کرنا نہایت ضروری ہے۔ وحی کی رُو سے عطا فرمودہ اصول، عالمگیر، ابدی اور غیر متبدل ہوتے ہیں، لیکن انسانی زندگی کے تقاضے اور نت نئے تجربات کی روشنی میں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے احوال و کوائف ہر آن بدلتے رہتے ہیں اور معاشرہ کو نت نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک ابدی اصولوں کا تعلق ہے ان میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ کسی کے ساتھ مفاہمت اور مصالحت۔ وہ ناقابلِ تغیر ہیں۔ لیکن اس سے انسانی فکر جامد نہیں ہو جاتا۔ اس کی تلاشِ علم کی راہیں کھلی رہتی ہیں اور پھر اس علم کو معاشرتی، سیاسی اور ٹیکنیکی مسائل کے حل کے لئے استعمال کرنے کے طور طریقوں کے میدان وسیع ہوتے ہیں۔ اسلام کے ابدی اصول، ہماری ترقی کی راہوں میں روک بن کر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ اس کے برعکس وہ، روشنی کے مینار کی طرح، اس دنیا اور آخری زندگی میں فوز و فلاح حاصل کرنے کے ہمارے راستوں کو منور کرتے چلے

جاتے ہیں۔ قرآن ہر مسلمان کو ترغیب (بلکہ حکم) دیتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے مظاہرِ فطرت پر غور و فکر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان (آدم) سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں سفرِ حیات طے کرنے کے لئے راہ نمائی عطا کرتا رہے گا۔ اس کے لئے اس نے حضرات انبیاء کرام کا سلسلہ دراز جاری رکھا جو حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر آکر ختم ہوگیا۔ اس طرح، اسلام خدا کی طرف سے نازل کردہ آخری دین قرار پاگیا۔ یہ اس لئے کہ تمام مذاہبِ عالم میں صرف اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، مرورِ زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک رواں دواں لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال حکمت بالغہ سے اسلام کو جب مکمل اور آخری دین قرار دیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ اس نے غیر متبدل، ابدی اصول عطا کرنے کے بعد انسان کو دعوت دی کہ وہ اپنی فکر و بصیرت کی رو سے، ان ابدی قوانین کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر منطبق کرے۔ یہ طریقِ خداوندی درحقیقت فکرِ انسانی کی پختگی کے لئے اختیار کیا گیا۔ (یہ طریق کار اس زمانے میں اختیار کیا گیا جب انسانی شعور عہدِ طفولیت سے آگے بڑھ کر عالمِ شباب تک پہنچ گیا۔ یعنی جب انسان بالغ) اور اس قابل ہوگیا کہ وہ، قرآن و سنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے تقاضائے حیات کا حل از خود دریافت کرسکے۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ وہ عملِ اجتہاد کو مسلسل جاری رکھے۔

یہ تصور کرلینا کہ کسی خاص زمانے میں قوانینِ شریعت کو مرتب کر دینے کے بعد اسلامی اصولوں کی تعبیرِ نو کا سلسلہ ختم ہوگیا، اسلام کی حقیقی روح کے منافی اور اپنے اوپر خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کرنے کے مرادف ہوگا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مختلف مکاتبِ فقہ کی نمود اس امر کی شاہد ہے کہ اس زمانے میں مختلف اربابِ فکر و دانش نے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے حل کے لئے اسلام کی نئی نئی تعبیرات کیں۔ انہوں نے فرمایا معاشرہ کی زندگی کے لئے قوانین ہی وضع نہیں کئے بلکہ وہ طریق بھی مرتب کئے جن کے مطابق زندگی کے نئے نئے مسائل کا حل دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعین کردہ یہ خاکے، وہ بنیادیں مہیا کرتے ہیں جن پر فقہ کی جدید عمارت استوار کی جا سکتی ہے۔ فقہ کو (غیر متبدل اور جامد قوانین کا مجموعہ نہیں سمجھنا چاہیئے) ایسی سائنس سمجھنا چاہیئے جس کی رو سے اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں پر منطبق کیا جاسکے۔ اس طرح فقہ کے دائرے کو وسیع کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ محض ایک تاریخی تذکرہ نہیں ہوگا۔ ایک متحرک لائحہ عمل ہوگا۔ یہ قرآن و سنت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، متقدمین کے وضع کردہ طریقِ کار کے مطابق، تدوینِ قوانین کا ارتقائی عمل ہوگا۔ اس کے لئے اسلام کی ہمہ گیر اور کلی حیثیت کو بہرحال پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ (صــــ۳-۴)

آپ نے غور فرمایا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں محترم خان صاحب کس طرح صحیح نتیجہ پر پہنچے ہیں جس کی روشنی میں صدیوں پرانے فقہی قوانین کو اس دور میں نافذ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عدل و احسان

اس کے بعد محترم خان صاحب نے بتایا ہے کہ اسلام کی اس ہمہ گیریت کی بنیاد کیا ہے؟ وہ بنیاد ہے :-

انھوں نے کہا ہے کہ عدل کا قرآنی مفہوم، عدالتوں کے قانونی مفہوم سے وسیع تر ہے۔ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ اسی طرح احسان کا مفہوم بھی "صدقہ خیرات" نہیں۔

یہ انسانی کردار میں تخلیقِ حسن کا نام ہے ـــــ علم میں حسن اور عمل میں بھی حسن۔ (ص۸)

اور یہی وہ عدل و احسان ہے جس کی بنیادوں پر اسلامی نظامِ معیشت کی عظیم عمارت استوار ہوتی ہے۔ یعنی وہ اصول جس کی رو سے "ملکیت" کا انقلاب آفریں نظریہ سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں ذاتی ملکیت کا تصور ہی باطل ہے ـــــ ذاتی ملکیت نہ فرد کی ہو سکتی ہے نہ مملکت کی۔ فرد کی ذاتی ملکیت کا نظریہ نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے اور مملکت کی ملکیت کا نظریہ کمیونزم کا۔ اور یہ دونوں نظام؛ اسلام کے نقیض اور انسانی آزادی کے لئے زہرِ ہلاہل ہیں۔ اسلام میں حقِ ملکیت صرف خدا کو حاصل ہے اور انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ذرائع پیداوار اور دولت کا استعمال اس طرح کرے جس سے وہ ذمہ داری ہو سکے جو خدا کی طرف سے اس پر عائد کی گئی ہے۔ یعنی

تمام افرادِ معاشرہ (مسلم اور غیر مسلم) کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا۔ (ص۶-۵)

مملکت کے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) وسائلِ پیداوار اس کی تحویل میں رہیں۔ وسائلِ پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین کو حاصل ہے اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں؛ اسلام کے معاشی نظام میں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اور

(۲) دولت کی تقسیم منصفانہ (یعنی ضرورت کے مطابق) ہو۔ اس کے لئے خان صاحب ممدوح نے قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کو پیش کیا ہے جو اس نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یعنی

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (۲/۲۱۹)

اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے وہ سب (ص۸)

یہ عدل و احسان پر مبنی نظام کو بروئے کار لانے کی عملی شکل ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ ایک حوض لبالب بھر گیا ہے۔ اس کا فالتو پانی اچھل کر باہر جائے گا۔ ساتھ ہی دوسرا حوض ہے جس میں پانی کی کمی ہے۔ یہ زائد پانی اس حوض میں گرتا جائے گا تاکہ دونوں حوضوں کی سطح برابر ہو جائے۔ پہلے حوض کا لبریز ہو جانا عدل ہے اور اس کے فاضلہ پانی کا دوسرے حوض کی طرف منتقل ہو جانا احسان۔ اس طرح معاشرہ کا توازن ہموار ہو جائے گا (احسان کے بنیادی معنی یہی ہیں) اور امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جائیں گے۔ تکریمِ آدمیت کا یہی تقاضا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآن کریم نے جنت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں طبقاتی تقسیم اور تفریق کا تصور تک نہیں۔ جنت کی تمام نعمتیں اور آسائشیں سب کے لئے برابر ہیں۔ اسی قسم کی جنت ارضی (اس زمین پر) تعمیر کرنا، قرآن کا منتہیٰ و مقصود ہے۔ اس سلسلہ میں خان صاحب فرماتے ہیں:-

اسلامی معاشرہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے جس میں ہر فرد کی انسانی صلاحیتیں اور مضمرات مکمل طور پر نشوونما پا سکیں۔ انسان؛ خدا کی ارفع ترین اور اعلےٰ ترین مخلوق ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بھی اسی نسبت سے گراں بار ہیں جنہیں اس نے نہایت دیانت اور امانت سے پورا کرنا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کے بعض بنیادی حقوق ہیں جن میں سرفہرست تکریمِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت ہے۔ اسلامی معاشرہ کی یہ

ذمہ داری ہے کہ اس کے ان حقوق کو ادا کرے اور اس کے شرف اور تکریم کی حفاظت کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کو نشو و ارتقا اور مسابقت و منافست کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ (صفحہ ۸)

یکساں مواقع مہیا کرنے کے لئے قدمِ اوّل عالمگیر نظامِ تعلیم ہے جس پر قرآن کریم میں اس قدر زور دیا گیا ہے۔ (صفحہ ۹)

اس کے بعد خان صاحب معاشرہ کی امّ الامراض یعنی ربٰو (یا سود) کی طرف آتے ہیں اور اس کی تباہ کاریوں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

اسلامی نظامِ معیشت کے قیام کے سلسلہ میں جن امور کو مرکزِ توجہ بنانے کی اوّلین ضرورت ہے ان میں سے بعض اہم اور نمایاں خطوط کی میں نے نشان دہی کر دی ہے۔ اس نظام کے متعین کرنے میں ماہرینِ اقتصادیات اور مدبرین امور کو، تقلید سے ہٹ کر، تجدید سے کام لینا ہوگا کیونکہ اس نظام کی طرف جانے والا راستہ پہلے سے معروف (جانا پہچانا) نہیں، بالخصوص عصرِ حاضر کا ذہن اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔ مثلاً ربٰو (INTEREST) جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیادی اینٹ ہے، اسلامی نظام میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ موجودہ نظام کی بعینہٖ کی پوری عمارت کو منہدم کئے بغیر ہم "سود سے پاک" نظام قائم کر لیں گے، انتہائی خوش فہمی ہوگی۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ربٰو (سود) کو ختم کر دینا مقصود بالذّات نہیں۔ یہ اسلامی نظام کے قیام کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ یعنی اس نظام کے قیام کے لئے جو ہر قسم کے استحصال اور سلب و نہب سے پاک ہوگا۔ سودی نظام بیشک استحصال ہے لیکن یہ سمجھنا کہ صرف یہی استحصال کا ذریعہ اور موجب ہے، اس حقیقت کا غماز ہوگا کہ ایسا سمجھنے والا موجودہ زمانے کی گوناگوں معاشرتی ناانصافیوں (کے جال) سے واقف ہی نہیں۔ اس زمانے میں، سلب و نہب اور استحصال کی بیسیوں اور شکلیں بھی ہیں ——— بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست ——— مثلاً نظامِ خرید و فروخت کو بے لگام چھوڑ دینا اس سے کہیں زیادہ موجبِ استحصال ہوگا۔ اسی طرح منافع (میں شراکت) بھی سود سے زیادہ سلب و نہب کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔

یہ سہل انگار خیال کہ موجودہ سود پہ مبنی نظام کا ایک متعین اور مستحکم متبادل نظام ہمارے ہاں موجود ہے، یا ہم نے اسے دریافت کر لیا ہے، (بڑا خطرناک ہے اور) میں قوم کو اس سے متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلامی اصلاح کا مغز اور غایت یہ نہیں کہ یہ دریافت کر لیا جائے کہ (موجودہ فقہی قوانین کی رو سے) کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔ ماہرینِ اقتصادیات کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس نہایت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ کا حل دریافت کریں کہ وہ کون سے طرق و ذرائع ہیں، جو جائز ہونے کے ساتھ، ہمیں اسلامی طرزِ زندگی سے قریب تر لے جا سکتے ہیں۔

میں یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سود جیسے ذریعہ استحصال کو مٹا کر اسلامی معاشرہ کو مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے کہ ہم نے مقصد حاصل کر لیا ہے۔ (اسے) اس سے کہیں آگے جانا ہوگا۔ اس کا فریضہ ہوگا کہ وہ ربٰو کی ان دیگر صورتوں کو بھی معلوم کرے اور انہیں مٹائے جو بظاہر ربٰو معلوم نہیں ہوتیں۔

کیونکہ انہوں نے مختلف نامون (اور اصطلاحات) کا نقاب اوڑھ رکھا ہے ...... موجودہ نظامِ اقتصادیات میں ربٰو (سود) نے جو مختلف روپ دھار رکھے ہیں؛ ہمیں ان سب کو بے نقاب کر کے ان کی جگہ اسلامی نظامِ معیشت قائم کرنا ہوگا۔ (صفحہ ۹)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں :-

سود کا مٹانا اور نظامِ زکوٰۃ کا نافذ کرنا بے شک صحیح سمت کی طرف ہنگامی اقدامات ہیں لیکن اسلامی نظامِ معیشت کی عمارت انہی ستونوں پہ استوار نہیں ہو سکتی۔

اور اس بصیرت افروز خطاب کا خاتمہ وہ ان الفاظ پہ کرتے ہیں :-

اس میدان تک پہنچنے کے لئے جو خدا کے نظامِ ربوبیت کی تابانیوں سے درخشندہ ہوگا، انسان کو تہ در تہ تاریکیوں کے غاروں میں سے گذرنا ہوگا۔ اس محیر العقول کارگہ کائنات میں ہر آن ایک نیا مرحلہ سامنے آتا ہے جو انسان کی تخلیقی کاوشوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ اسی لئے ہماری تحقیقی اور تخلیقی کوششوں اور کاوشوں کو کسی ایک مقام پہ رک نہیں جانا چاہیئے) ارضی زندگی کا ایک تضاد (PARADOX) یہ بھی ہے کہ جب تک ہم اپنی محبوب ترین متاع اور عزیز ترین خواہشات کو قربان نہیں کر دیتے، لیلائے حسن و حیات کے محمل تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اس وادی میں حقیقی مسرت کا راز لینے میں نہیں، دینے میں ہے"۔ لہٰذا، ہمیں اس محمل کو اپنے سفر کا منتہٰی قرار دیتے ہوئے، آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے، اس ایمان اور ایقان کے ساتھ کہ

إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ (۷/۱۷۰)

ہم ان لوگوں کی محنت کو کبھی ضائع نہیں کرتے جو انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے کوشاں ہوں۔ (صفحہ ۱۲)

اس حقیقت کشا اور دانش افروز خطاب کو پیش کرنے کے بعد ہم اس سے زیادہ کیا عرض کر سکتے ہیں کہ

دیدہ ام مردے" دریں قحط الرجال

محترم خان غلام اسحاق خان صاحب نے، ان فراموش کردہ قرآنی حقیقتوں کو جس جرأت اور بصیرت کے ساتھ واشگاف کیا ہے اس پر ہم اپنی اور اپنے ہزارہا قارئین کی طرف سے ان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں کہ وہ ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لئے اپنے حیطۂ امکان میں پوری پوری کوشش کریں گے۔ مبداء فیض کی کرم گستری نے انہیں یہ موقع اور مقدرت فراہم کر دی ہیں کہ وہ پاکستان کے معاشی نظام کو قرآنی خطوط کے راستے پہ ڈال دیں۔ اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو یہ نہ صرف ان کے لئے وجۂ سرفرازیٔ دارین ہوگا بلکہ مسلمانوں کے دیگر ممالک پہ بالخصوص اور غیر مسلم اقوام پہ بالعموم احسانِ عظیم ہوگا کہ وہ اسلام کے معاشی نظام کو ماڈل کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھ کر موجودہ جہنمی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

خطاب میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جو ہمیں کھٹکتے ہیں۔ بعید از دیانت ہوگا اگر ہم ان کی نشاندہی نہ کریں۔

(۱) مضاربت

خان صاحب نے اپنے خطاب میں کہا ہے کہ کاروباری منافع، سود سے کم استحصال انگیز نہیں اور منافع میں شراکت ربوا ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ملک میں مضاربت کی ترویج کو مستحسن اقدام قرار دیتے ہیں (صلا) جب اسلام میں ربوا کی ہر شکل حرام ہے تو مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP) کیسے جائز ہو سکے گی؟ اس سے تو نظام سرمایہ داری اسی طرح استوار رہے گی۔

(۲) زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم، اسلامی نظام میں فٹ ہی نہیں بیٹھتا۔ جب "قل العفو" کی رو سے زائد از ضرورت روپیہ کسی کے پاس رہتا ہی نہیں تو زکوٰۃ کس روپے پر لی جائے گی! زکوٰۃ، جمع شدہ روپے میں سے ایک خاص شرح کے مطابق کٹوتی کا نام نہیں۔ زکوٰۃ کے معنی افرادِ معاشرہ کو نشوونما بہم پہنچانا ہے جو اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ محترم خان صاحب ان نکات پر مزید غور فرمائیں گے۔ اگر وہ انہیں "عبوری دور" کے اقدامات قرار دیتے ہیں تو انہیں اس کی صراحت کر دینی چاہیئے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا اشتباہ یا الجھاؤ نہ رہے۔

صدرِ پاکستان کا افتتاحی خطاب

محترم غلام اسحاق خان کے استقبالیہ کے بعد صدرِ پاکستان، جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنے خطاب سے سیمینار کا افتتاح فرمایا۔ یہ خطاب نسبتاً مختصر تھا کیونکہ (جیسا کہ صدرِ محترم نے فرمایا) جو تفصیلات غلام اسحاق خان صاحب کے استقبالیہ میں آ چکی تھیں، وہ ان کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ یہ خطاب اردو میں تھا اس لئے ہم اس کے ضروری اقتباسات بالفاظہٖ پیش کریں گے اور ان کے ساتھ مختصر الفاظ میں اپنا تبصرہ بھی۔ ہم صدرِ مملکت کو مستحقِ مبارکباد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس قسم کے بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام فرمایا جس میں قرآن کریم کے معاشی نظام کے نمایاں خط و خال صدیوں کے بعد دنیا کے سامنے آئے۔ عصرِ حاضر میں اس کی بالخصوص بڑی ضرورت تھی کیونکہ اقوامِ عالم، انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام کو آزما چکی ہیں اور ان کی تباہ کن ناکامیوں کے بعد کسی ایسے نظام کے لئے مضطرب و بیقرار اور غلطاں و پیچاں ہیں جو انہیں اس جہنم سے نجات دلا سکے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ سیمینار وقت کی اہم ضرورت تھی۔

ابتدائی تعارف کے بعد، صدرِ محترم نے فرمایا:۔

> آج تک اس دنیا میں جتنے معاشیاتی یا اقتصادیاتی نظام آزمائے گئے ہیں ان سب کا یہاں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے میں آپ کی توجہ صرف ان دو معاشی نظاموں کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جو آج

دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں زیرِ عمل ہیں۔ ایک کو ہم سرمایہ داری نظام کا نام دیتے ہیں اور دوسرے کو اشتراکیت! غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ان دو نظاموں پر عمل کر کے بنی نوع انسان نے اپنی معاشی نجات حاصل کر پائی ہے یا اس کی دشواریاں پہلے سے بڑھ گئی ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان نظاموں نے بنی نوع انسان کی مصیبتوں کا مداوا کرنے کی بجائے انہیں مزید الجھا دیا ہے مثلاً سرمایہ دارانہ نظام انسان کو آزادی تو دیتا ہے لیکن روزی کے ذرائع صرف ایک طبقے کی مٹھی میں رکھ دیتا ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ جس کے ہاتھ میں وسائل ہوتے ہیں اس کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا رہتا ہے۔ یہ مراعات یافتہ طبقہ دوسرے انسانوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کا استعمال تو کرتا ہے لیکن رزق کے خزانے خود جمع کرتا رہتا ہے جس میں محنت کشوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

دوسری طرف اشتراکی نظامِ معیشت ہے جو انسان کو اس کی بنیادی ضروریات کا سُراب دکھا کر اس کی انفرادی آزادی کو سلب کر لیتا ہے۔ اس نظام میں محنت کش انسان کی حالت اُس بیل کی طرح ہوتی ہے جو زندگی بھر ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے اور صبح و شام اس کی مادی ضروریات اس حد تک پوری کر دی جاتی ہیں کہ اس کے جسم میں اگلے دن کام کرنے کے لئے زندگی اور توانائی باقی رہے۔ میں یہاں کسی حکومت پر نکتہ چینی نہیں کر رہا ہوں اس فلسفۂ حیات پر اظہارِ خیال کر رہا ہوں جس نے اس صدی کے آغاز میں انسان کو معاشی نجات کا ایک نیا رُخ دکھایا تھا لیکن عملاً ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہ نیا رُخ ایک نئے سُراب سے مختلف نہیں تھا۔

ان دونوں معاشی نظاموں کا تقابلی جائزہ لینے سے یہ واضح حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک میں آزادی ہے لیکن روزی نہیں اور دوسرے میں روزی ہے تو آزادی نہیں۔ میرے خیال میں بنی نوع انسان کو ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جس میں انسان کو روزی کی خاطر آزادی سے اور آزادی کی خاطر روزی سے نہ محروم ہونا پڑے۔ اور میرا یہ پختہ ایمان ہے کہ یہ اوصاف اسلامی نظام اور صرف اسلامی نظام ہی مہیا کر سکتا ہے۔

صدرِ محترم نے ان دونوں نظاموں کا صحیح تجزیہ فرمایا ہے۔ لیکن اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو محنت کش اور فرد کا سب کو آزادی نہ نظامِ سرمایہ داری میں حاصل ہوتی ہے نہ اشتراکیت میں۔ نظامِ سرمایہ داری میں، سرمایہ دار طبقہ کو دولت سمیٹنے کی بے حد و نہایت آزادی ہوتی ہے اور فرد کا سب روٹی کے لئے ان کا محتاج ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں اس نظام میں ؎

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

اشتراکیت میں بھی یہ تفریق و تقسیم برابر رہتی ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس میں سرمایہ دار طبقہ کی جگہ حکمران طبقہ لے لیتا ہے اور یہ کہہ کر محنت کشوں کو فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ یہ تمہاری حکومت ہے۔ اس فریب کا نقاب اُلٹتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

روزی اور آزادی صرف قرآن کے معاشی نظام میں مل سکتی ہے جس میں نہ غریب اور امیر کے طبقات ہوتے ہیں نہ حاکم و محکوم میں کوئی تفاوت۔ وہاں اعلان یہ ہوتا ہے کہ ؎

کس دریں جا حاکم و محکوم نیست عبد و مولا، سائل و محروم نیست

(۰)

اس کے بعد صدرِ محترم نے پہلے یہ کہا کہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری زندگی میں احیائے اسلام کے نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جرأت مندانہ انتباہ بھی کیا کہ

اس خوش آئند ماحول میں، میں یہ تلخ حقیقت بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ اسلام صرف تقریروں اور نعروں کے زور پر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کو صرف ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے مقبول نہیں بنایا جا سکتا۔ اسلام مسجدوں کے منبروں اور بین الاقوامی سیمیناروں کے اسٹیج سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ساری کوششیں اپنی اپنی جگہ نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ لیکن میرا یہ پختہ یقین ہے جب تک آپ انسان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا کوئی تسلی بخش اسلامی طریقہ دریافت نہیں کرتے، نفاذِ اسلام کا عمل تسلی بخش طور پر آگے نہیں بڑھ سکتا حقیقت یہ ہے کہ آج انسان کی مادی ضروریات اس کے خیالات پر حاوی ہیں۔ اس صورتِ حال میں جو نظریۂ حیات بھی انسان کی معاشی اور مادی ضروریات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔ لہٰذا میں اسلام کے معاشی اور مالیاتی ماہرین کے اس اجتماع سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی اوّلین توجہ اس بات پر صرف کریں کہ ہم احیائے اسلام کی نئی لہر سے استفادہ کرتے ہوئے کس طرح اسلام کے معاشی نظام کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ جب تک ہم نے اس مسئلے کا حل تلاش نہ کیا دوسرے شعبوں میں ہماری کوششیں بارآور نہ ہو سکیں گی۔

صدرِ محترم کا تجزیہ کہ

جب تک آپ انسان کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا کوئی تسلی بخش اسلامی طریقہ دریافت نہیں کرتے نفاذِ اسلام کا عمل تسلی بخش طور پر آگے نہیں بڑھ سکتا ..... جو نظریۂ حیات بھی انسان کی معاشی اور مادی ضروریات کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرے گا زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔

یہ، قرآن کریم کے پیش کردہ طریقِ کار کے عین مطابق ہے۔ اس نے بڑے بصیرت افروز انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ نظامِ اسلام پر اسی صورت میں عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے جب انسان "بھوک اور خوف کی طرف سے مطمئن ہو"۔ قرآن کریم کے آخری پارہ کی آخری سورتوں میں ایک مختصر سی سورۃ (القریش) میں اس نکتہ کی وضاحت بڑے بلیغ انداز میں کی گئی ہے۔ زمانہ قبل از اسلام میں، نظم و ضبط کی ابتری کا یہ عالم تھا کہ کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ شاہراہوں پر قافلے لٹتے تھے اور بستیوں میں سلب و نہب کا بازار گرم رہتا تھا۔ ایک قریش کا قبیلہ تھا جو ہر طرح محفوظ و مامون رہتا تھا۔ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے ان کا اس قدر احترام تھا کہ ان

کے قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فرمایا :-

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۱-۲)

ان کے اسی احترام کی وجہ سے دوسرے قبائل نے ان سے یہ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ ان کے قافلے سردی گرمی جہاں جی چاہے آتے جاتے رہیں، انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔

اس سے انہیں کسی قسم کا خوف نہ رہا۔ اور اس محفوظ تجارت کے نتیجہ میں وہ روٹی کی طرف سے بھی مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد قرآن نے کہا کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۱۰۶/۳-۴) جب انہیں نہ کسی قسم کا خوف رہا اور نہ ہی روٹی کی فکر، تو اس کے بعد ان کے پاس کونسا عذر رہ جاتا ہے کہ وہ خدا کی محکومیت اختیار نہ کریں!

اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم سے نظامِ اسلامی کی اطاعت کا تقاضا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے خوف کی طرف سے مطمئن اور روٹی کی فکر سے آزاد کیا جائے۔ اگر اس پر خوف طاری رہے گا اور وہ روٹی کے فکر میں غلطاں و پیچاں ہو گی تو وہ اس نظام کو قائم ہی نہیں کر سکے گی۔ اگر انہیں ان دونوں فکروں سے آزاد کر دیا جائے تو پھر ان کے پاس کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہے گی کہ وہ اس نظام کو قائم نہ کریں، اور خدا کو چھوڑ کر انسانوں کی محکومیت اختیار کریں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲)۔ "بھوک اور خوف" کو خدا کا عذاب کہا ہے۔ سو جو قوم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو، وہ نظامِ خداوندی کس طرح قائم کر سکے گی؟

بنا بریں، صدرِ مملکت نے بجا طور پر کہا ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے پروگرام میں قدمِ اوّل، قوم کی معاشی مشکلات کو حل کرنا ہوگا۔ اس پروگرام کا آغاز ہی یہاں سے کیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام قائم کرنے کے لئے قوم کی ذہنیت میں انقلاب ضروری ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صدرِ محترم نے کہا ہے کہ

> اسلام کا مالیاتی اور محصولاتی نظام صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے کہ زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اسلامی اقدار کو جاری و ساری کیا جائے۔ (ص ۱۲)

انسانی ذہنیت اقدار کے بدلنے سے بدلتی ہے۔ اور اقدارِ خداوندی کی ترویج اور فروغ کا نام اسلامی نظام ہے۔

(٥)

اس کے بعد صدرِ محترم اس نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

> ان خامیوں کی نشاندہی کرتے وقت میں نے جگہ جگہ کہا ہے کہ ان مسائل کا حل اسلام کے معاشی اور مالیاتی نظام اپنانے میں ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا ہے؟ اس کے بنیادی خدوخال کیا ہیں؟ اس موضوع پر بہت سے علماء اور ماہرینِ اقتصادیات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ کچھ پہلوؤں کی نشاندہی آج علامہ اسحاق صاحب نے بھی کی ہے۔ جہاں تک میں نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے میرے خیال میں اسلامی معاشی نظام کی بنیادی خصوصیات جو آپ نے پہلے بھی سنی ہوں گی، تین ہیں :-

(۱) اسلام زمین و آسمان پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرتا ہے اور انسان کی دولت یا زمینی وسائل کا مالک ہونے کی بجائے اس کا امین قرار دیتا ہے۔ ملکیت کا یہ تصور اسے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظاموں سے متمیز کرتا ہے جن میں دولت کا مالک انسان ہوتا ہے یا مملکت، نہ کہ خدا۔

(۲) اسلام کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کی معیشت "عدل و احسان" پر قائم ہوتی ہے جس کی تشریح پہلے ہی کی جا چکی ہے۔

(۳) اسلام نے ارتکازِ دولت کو روکنے کے لئے زکوٰۃ، خیرات اور صدقات کا بڑا مفید نظام قائم کیا ہے تاکہ دولت مندوں کی فالتو دولت حاجتمندوں تک پہنچ سکے۔ آپ کو قرآن کا حکم یاد ہوگا جس میں ایک مکالمے کی شکل میں کہا گیا ہے "اے رسولؐ! تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دے دیں ان سے کہہ دو کہ جس قدر اپنی ضروریات سے زائد ہے وہ سب" گویا اسلام میں زور، لینے یا جمع کرنے پر نہیں بلکہ دینے پر ہے۔

کسی بھی اسلامی ملک میں معاشی نظام مرتب کرتے وقت انہی بنیادی اصولوں کے پیشِ نظر رکھنا ہوگا اور اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس نظام کی جزئیات طے کرتے وقت ہم ان اصولوں کی روح سے نہ ہٹنے پائیں۔ (صفحہ ۱۱۰)

یہاں ایک نکتہ وضاحت طلب ہے۔ قرآنی نظام اپنی تکمیل تک بتدریج پہنچے گا۔ قرآن کریم نے جہاں اس کی مکمل شکل کے خطوط اور حدود پیش کئے ہیں، اس کے عبوری دور کے لئے بھی احکام عطا کئے ہیں۔ خیرات، صدقات وغیرہ، اس عبوری دور کے احکام ہیں۔ اس مکمل شکل میں تو نہ کوئی غریب اور محتاج ہوگا جو اسے خیرات و صدقات کی ضرورت پڑے۔ نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت ہوگی جو وہ خیرات اور صدقات دے سکے۔ خیرات اور صدقات کا ذکر کرتے وقت اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ یہ عبوری دور کے احکام ہیں۔

اس کے بعد صدرِ محترم نے ایک خاص دشواری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

یہاں میں یہ سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ اگر اسلام کا تجویز کردہ معاشی نظام اتنا ہی صحتمند اور اچھا ہے تو یہ آج تک مکمل طور پر کسی خطۂ زمین پر کیوں نافذ نہیں کیا گیا؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان عہدِ غلامی میں اس طرف توجہ نہ دے سکے؟ میرے خیال میں اپنی کوتاہی کی ذمہ داری دوسروں پر نہیں ڈالی جا سکتی کیونکہ عہدِ غلامی کے چند سو سالوں سے پہلے مسلمان ایک طویل عرصے تک آزاد اور حکمران رہے ہیں اور موجودہ صدی عیسوی میں بھی بہت سے مسلمان ملکوں کو آزاد ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں عہدِ ماضی یا دورِ حاضر میں اسلام کے معاشی نظام کا کوئی مکمل عملی نمونہ نظر نہیں آتا جسے ہم ایک ماڈل سمجھ کر اپنا سکیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اسلام کے رہنما اصول موجود ہیں۔ ان پر ہمارا اعتقاد کامل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان اصولوں کو اپنانے سے ہم اپنے معاشی اور اور اقتصادی مسائل حل کر سکتے ہیں لیکن جہاں ہم اٹک جاتے ہیں وہ طریقۂ کار ہے۔ وہ ان اصولوں

کو نافذ کرنے کا لائحہ عمل ہے۔ اور یہ وہ میدان ہے جہاں آپ جیسے مالیاتی اور معاشی ماہرین کی خدمات کی اشد ضرورت ہے۔ آپ اس میدان میں ہراول دستے کا کام دے سکتے ہیں۔ مجھے ہی نہیں پورے عالمِ اسلام کو آپ سے بڑی توقعات ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کے معاشی نظام کے اصول قرآن کی دفتیں میں محفوظ چلے آرہے تھے، لیکن عملاً امت کی روش ان کے خلاف تھی۔ صدرِ اوّل کے بعد، جب ملوکیت چھا گئی تو اس کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری بھی ہم پر مسلط ہو گیا ـــــ ملوکیت اور سرمایہ داری لازم و ملزوم ہیں ـــــ اور طرّہ یہ کہ مذہبی پیشوائیت نے بھی اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اس سے یہ نظام عین مطابقِ اسلام قرار پا گیا۔ طلوعِ اسلام نے جب قرآن کا معاشی نظام پیش کیا تو قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ اسے کمیونزم قرار دیا گیا اور کفر کے فتوے صادر کئے گئے۔ علامہ اقبال نے (اپنی حقیقت کشا نظم ـــ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ـــــ میں) ابلیس کی زبانی اسی حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!

اس کے ساتھ ہی اس نے (ابلیس نے) یہ خطرہ بھی ظاہر کیا کہ

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

کس قدر مقامِ مسرت و تبریک ہے یہ حقیقت کہ یہ شرعِ پیغمبر پاکستان کے قصرِ حکومت کے سرا پردوں سے آشکارا ہو رہی ہے! اقبال نے جب ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کی تائید میں کہا تھا کہ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسلام پر عرب ملوکیت نے جو اپنی چھاپ لگا رکھی ہے، اس سے وہ چھاپ مٹ جائے گی۔ اس سے ان کا مطلب نظامِ ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری تھا۔ صدیوں کے بعد پاکستان کے ایوانِ حکومت سے یہ آواز سنائی دی کہ نظامِ سرمایہ داری خلافِ اسلام ہے۔ اگر اس آواز نے عملی پیکر اختیار کر لیا تو اس مملکت کے ساتھ اقبال کی جو توقعات وابستہ تھیں، وہ پوری ہو جائیں گی اور پاکستان کا مطلب صاف سمجھ میں آجائے گا۔

(۰)

آخر میں صدرِ مملکت نے شرکائے سمینار کے سامنے چند ایک سوال پیش کئے اور کہا کہ

مجھے امید ہے کہ دنیا بھر سے تشریف لانے والے ماہرین اس سمینار میں ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور اس تذاکرے کے اختتام تک یہ ایسا لائحہ عمل مرتب کر سکیں گے جسے اپنا کر ہم اسلام کا صحیح معاشی نظام رائج کر سکیں۔

چونکہ سمینار کی روئداد ہمارے سامنے نہیں آئی (حالانکہ منتظمین حضرات کو چاہیئے تھا کہ اس کی کاروائی کا ملخص ساتھ کے ساتھ عام کر لیتے جاتے) اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان ماہرین نے ان سوالات کا کیا جواب پیش کیا۔ ہم اپنی بصیرت کے مطابق ان کا جواب پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔

وبیدہ التوفیق

سوالات

(۱) کیا موجودہ بین الاقوامی استحصالی نظامِ معیشت سے نجات ممکن ہے؟

جواب: قرآن کریم نے بتایا ہے کہ تاریکی اپنا مستقل وجود نہیں رکھتی۔ یہ روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ روشنی آجانے سے تاریکی خود بخود معدوم ہو جاتی ہے۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷/۸۱) اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ حق کا نظام قائم ہونے کی دیر ہے۔ باطل کا نظام خود بخود مٹ جائے گا۔ اس لئے کہ باطل حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔"

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

آپ اس نظام کو عملاً شروع کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ظلم و استبداد کی ستائی ہوئی دنیا کس طرح لپک کر اس کی طرف آتی ہے! وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (۱۱۰/۲) اور اس نظام کے حصارِ عافیت میں فوج در فوج داخل ہو جاتی ہے۔ استحصالی نظام کا خاتمہ، نظامِ ربوبیت کے انسانیت ساز نتائج کے محسوس طور پر سامنے آنے سے ہوگا۔ اور یقیناً ہوگا۔

(۲) کیا دنیا میں بیک وقت دو یا دو سے زیادہ متوازی نظامِ معیشت کسی قسم کی کشیدگی کے بغیر چل سکتے ہیں؟

جواب: ابتداء میں حق اور باطل کے نظام میں کشیدگی، بلکہ کش مکش ضرور رہے گی لیکن حق پر مبنی نظام میں اتنی قوت ہوگی کہ باطل کا نظام اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ "باطل کے نظام پر حق کی ضرب اس قدر کاری ہوتی ہے کہ اس (باطل کے نظام) کا بھیجا نکل جاتا ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔" خدائے تعالےٰ نے جو پوری تحدی کے ساتھ کہا تھا کہ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ (۴۸/۲۸) اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا ہے، تو یہ نظام، دنیا کے تمام نظاموں پر غالب آکر رہے گا۔" یہ ارشادِ خداوندی ہے جس کی صداقت پر ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کا نظامِ ربوبیت قائم اور رائج ہو گیا تو کوئی دوسرا نظام باقی ہی نہیں رہے گا۔ مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف ایک نظام کا محض خواب دیکھا تھا تو دنیا کی وسیع و عریض مملکتوں کی فلک بوس عمارات کی بنیادوں میں تزلزل واقعہ ہو گیا تھا۔ اسے کہیں قرآنی نظام کی اساس محکم مل جاتی تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ بہرحال، قرآنی نظام جب بھی قائم ہوا، باطل کا کوئی نظام اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔

(۳) کیا تمام اسلامی ممالک میں ایک سا معاشی نظام ممکن ہے؟

جواب: مسلمان ممالک اسلامی اس وقت کہلا سکیں گے جب وہ قرآن کریم کو واحد اور مکمل ضابطۂ حیات تسلیم کر لیں گے۔ جب ان کا ضابطۂ حیات ایک ہوگا تو ان کا معاشی نظام ایک سا کیوں نہیں ہوگا؟ صرف معاشی نظام نہیں۔ اس وقت تو ان کا ہر نظامِ حیات ایک سا ہوگا۔ اس وقت یہ سب ایک اُمت کے افراد ہوں گے۔

(۴) کیا موجودہ مالیاتی اور معاشی نظام کو بدلنے کے لئے ہمارے پاس متبادل لائحہ عمل موجود ہے۔ اگر نہیں تو اسے کتنی جلدی اور کس طرح تیار کیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ موجودہ نظام کو بالکلیہ تبدیل تو بتدریج کیا جا سکے گا البتہ قرآنی نظام کا آغاز بلا تاخیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی حدود، واضح اور غیر مبہم طور پر متعین کر کے سامنے رکھ لی جائیں اور پھر دیکھا جائے کہ اس کی طرف پیش رفت کی ابتدا کہاں سے کی جائے۔ اس باب میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس میں کسی قسم کی پیوند سازی سے کام نہ لیا جائے۔ نہ دنیا میں رائج کسی نظام کی اور نہ ہی اس نظام کی جو خود ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے۔ جذباتی آئیڈیلزم کو چھوڑ کر اس پروگرام کی ابتدا، کم از کم اس سے کی جائے کہ (نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق) مملکت میں رات کو بھوکا کوئی نہ سوئے۔ اور کسی حقدار کو اپنا حق لینے کے لئے، در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑیں۔

(۵) کیا ہمارے پاس "عدل و احسان" پر مبنی معاشی نظام کی تمام جزئیات موجود ہیں؟

جواب:۔ جب ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی) عدل و احسان، پر مبنی نظام قائم ہی نہیں تو اس کی جزئیات موجود کس طرح ہو سکتی ہیں؟ قرآن کریم نے اس نظام کے جو اصول دیئے ہیں، ان کی جزئیات، ہم اپنے حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں گے۔ اسلام میں، معاشی نظام ہی نہیں، بلکہ ہر قسم کے ضابطہ، قوانین اور نظام کے مرتب کرنے کا یہی طریق ہے۔ غلام اسحٰق خان صاحب کے استقبالیہ میں اس اہم نقطہ پر بھی بڑی اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۶) کیا سود استحصال کی واحد صورت ہے جسے ختم کرنے سے ہماری تمام مصیبتیں دور ہو جائیں گی؟

جواب:۔ سود (اپنے مروجہ مفہوم کے مطابق) نظامِ سرمایہ داری کی صرف ایک استحصالی شکل کا نام ہے۔ قرآن کریم نے ربوٰ کو حرام اور اسلامی نظام کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے۔ ربوٰ سے مراد کلیتہً نظامِ سرمایہ داری ہے نہ کہ اس کا کوئی ایک گوشہ۔ ہم (مسلمانوں) نے جب نظامِ سرمایہ داری اختیار کیا تو اس کی صرف ایک شکل ـــــ ذاتی سود ـــــ کو حرام قرار دے لیا اور باقی تمام استحصالی ذرائع (مزارعت۔ مضاربت۔ منافع میں شراکت وغیرہ) کو شیرِ مادر کی طرح حلال۔ ہماری مصیبتیں صرف اس صورت میں دور ہو سکیں گی جب ہم نظامِ سرمایہ داری کو کلیتہً مسترد کر کے اس کی جگہ قرآن کا معاشی نظام رائج کریں گے۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے، سرمایہ کا نہیں۔ اسی لئے وہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہنے ہی نہیں دیتا۔

(۷) کیا صرف نظامِ زکوٰۃ رائج کرنے سے غربت اور افلاس کا نام و نشان مٹایا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو ہمیں اور کیا اقدامات کرنے ہوں گے؟

جواب:۔ زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ جتنی جی چاہے دولت جمع کرو۔ اس میں سے کچھ پیسے غریبوں اور محتاجوں کو بطور خیرات دے دو۔ باقی سارا مال حلال و طیب ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور نظامِ سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ زکوٰۃ کے معنی نشوونما کے ہیں اور قرآن کریم نے "ایتائے زکوٰۃ" کو حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ (۲۲/۴۱) اس سے مراد یہ ہے کہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ اگر ہم زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم

کو اسلامی سمجھتے رہے تو نظامِ سرمایہ داری کبھی ختم نہیں ہو سکے گا۔ اور جب تک نظامِ سرمایہ داری ختم نہیں ہوگا ہماری مصیبتیں دُور نہیں ہو سکیں گی۔ زکوٰۃ (بمعنی خیرات) مزارعت (زمین کی پیداوار میں مالکِ زمین کا حصّہ) مضاربت (کاروباری منافع میں شراکت) وغیرہ سب نظامِ سرمایہ داری کی تخلیق ہیں۔ اور قرآن کی رُو سے ربوٰا میں داخل ہیں۔ نظامِ زکوٰۃ کے معنی ہیں قرآن کا پورے کا پورا معاشی نظام جس کا مقصود تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشوونما بہم پہنچانا ہے۔

(۰)

یہ سب کچھ کہنے اور سمجھنے کے باوجود وہ بنیادی سوال باقی رہ جاتا ہے جو اس نظام کی اساس ہے۔ جیسا کہ استقبالیہ میں محترم وزیر مالیات نے اور افتتاحیہ میں صدرِ مملکت نے فرمایا ہے کہ اسلامی نظام کی اساس "دینے میں ہے، لینے میں نہیں"۔ مارکس نے جب یہ کہا تھا کہ دنیا کی نجات اس قسم کے نظام میں ہے کہ

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق بھرپور محنت کرے لیکن اس میں سے صرف اپنی ضرورت کے ماتحت لے۔

تو اس سے پوچھا گیا کہ یہ کیسے ممکن ہوگا کہ ایک شخص جان مار کر محنت کرے اور اپنی کمائی میں سے صرف بقدرِ ضرورت لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ اس کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہوگا؟ تو اس نے کہا تھا کہ یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا۔ لیکن انسانیت کی نجات بہرحال اس نظام میں مضمر ہے۔ جب بھی یہ جذبۂ محرکہ دریافت ہو گیا، یہ نظام قائم ہو جائے گا۔

یہ جذبۂ محرکہ قرآن مہیا کرتا ہے۔ اس کی رُو سے انسانی زندگی صرف اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) نہیں۔ یہ زندگی جسم کی زندگی ہے جو کھانے پینے سے قائم رہتی ہے اور موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اس تصوّر کی رُو سے وہ جذبۂ محرکہ واقعی نہیں مل سکتا جس کی رُو سے انسان جان مار کر محنت کرے اور اس میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر باقی سب دوسروں کے لئے دے دے۔ اور ایسا ساری عمر کرتا رہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے انسانی زندگی صرف اس کے جسم کا نام نہیں۔ اس میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے اس کی ذات (یا نفس) کہتے ہیں۔ جس طرح انسانی جسم کی پرورش کی ضرورت ہے اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کی بھی ضرورت ہے۔ جو انسانی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما، ان اقدارِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعے ملی ہیں۔ ان اقدار میں سرِفہرست، دوسروں کے لئے "دینا" ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے، جسم کی پرورش "لینے" سے ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما "دینے" سے۔

قرآنی مسلمان زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس میں سے اپنے جسم کی پرورش کے لئے رکھ کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ یہ ہے وہ جذبۂ محرکہ جس کی رُو سے، وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور کم از کم اپنے لئے رکھتا ہے۔ اور یہی جذبۂ محرکہ

قرآن کے معاشی نظام کے لئے اساس محکم مہیا کرتا ہے جو نہ مغرب کے سیکولر نظام میں مل سکتی ہے، نہ روس اور چین کی اشتراکیت میں۔

قرآن کا معاشی نظام نہ تو قانون کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے نہ ڈنڈے کے زور پر۔ یہ اس جذبۂ محرکہ کی رُو سے قائم ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور یہ جذبہ ایسی تعلیم کی رُو سے پیدا ہوتا ہے، جس میں انسان اپنی ذات کی اسی طرح محسوس کرے جس طرح اپنی طبیعی زندگی کو محسوس کرتا ہے اور اس کی نشوونما کو اپنی زندگی کا مقصود و منتہیٰ قرار دے۔ اس قسم کی تعلیم اس وقت (باقی دنیا تو ایک طرف خود) ہمارے ہاں بھی موجود نہیں نہ سکولوں اور کالجوں میں، نہ مکتبوں اور دارالعلوموں میں۔ اگر یہاں اسلام کا معاشی نظام رائج کرنا ہے تو اس کے لئے موجودہ نظام تعلیم کو بدل کر اس کی جگہ ایسا نظام رائج کرنا ہوگا جس سے یہ جذبۂ محرکہ ہماری آنے والی نسلوں کے قلب کی آواز بن کر اُبھرے۔ اس کے بغیر اسلامی نظام سمجھ میں تو آسکتا ہے، عمل میں نہیں آسکتا۔ اس جذبہ کا دل کی گہرائیوں سے اُبھرنا ایمان کہلاتا ہے۔ اور اسلامی نظام اس ایمان کی عملی تفسیر۔ جب یہ نظام پہلی مرتبہ صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا تو تعلیم کے ذریعے، قلب و نگاہ کی اسی تبدیلی سے قائم ہوا تھا۔ اور اب، جب بھی دوبارہ قائم ہوگا تو اسی طریق سے ہوگا۔

فہرست معطیانِ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (۱۳ دسمبر ۱۹۸۰ء تا ۱۸ جنوری ۱۹۸۱ء)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۔ ایم غوث سعید صاحب ۔ پپلاں لیاقت آباد	۱۰۰/-	۳۷۹۲
۲۔ نور محمد مرحوم معرفت سید معصوم علی شاہ صاحب سلانوالی	۳۰۰/-	۳۷۹۳
۳۔ محمد صدیق خان صاحب ۔ ملتان	۱۰۰/-	۳۷۹۴
۴۔ محترمہ زہرہ اعجاز صاحبہ ۔ کالونا نجیریا	۱۰۰۰/-	۳۷۹۵
۵۔ غلام حسین آسی صاحب ۔ پپلاں میانوالی	۵۰/-	۳۷۹۶
۶۔ عبدالمجید آسی صاحب معرفت بزم طلوع اسلام ۔ ملتان	۵۰/-	۳۷۹۷
۷۔ نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے ۔ لاہور	۱۰۰/-	۳۷۹۸
۸۔ ایم ریاض صاحب شیفرڈ بش لندن معرفت طلوع اسلام ۔ لندن	۴۵۶۹/۵۵	۳۷۹۹
۹۔ غلام محمد جعفری صاحب ۔ ویمبلے مڈل سیکس " " " "	۱۱۴/۲۵	۳۸۰۰
۱۰۔ سعید اختر صاحب ۔ ناتھ ہولٹ مڈل سیکس " " " "	۱۱۴/۲۵	۳۸۰۱
۱۱۔ نجم الحسن صاحب ۔ ساؤتھ ہال بذریعہ راجہ محمد اعظم صاحب " " "	۲۲۸/۵۰	۳۸۰۲
۱۲۔ راجہ محمد اعظم صاحب " " معرفت بزم طلوع اسلام ۔ لندن	۲۲۸/۵۰	۳۸۰۳
۱۳۔ راجہ محمد معظم صاحب (" ") بذریعہ راجہ محمد اعظم صاحب " " "	۲۲۸/۵۰	۳۸۰۴
۱۴۔ اصغر صاحب ۔ ناتھ بذریعہ ایم ۔ اے رانی " " "	۱۱۴/۲۵	۳۸۰۵
۱۵۔ محترمہ مسز اصغر صاحبہ " " " " " "	۳۵/۲۰	۳۸۰۶

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
محترم		
۱۶۔ محمد الحسن رازی صاحب معرفت بزم طلوع اسلام ۔ لندن	۲۲۸/۵۰	۳۸۰۷
۱۷۔ محترمہ مسز ظفر سعید صاحبہ ۔ سیالکوٹ	۳۰۰/-	۳۸۰۸
۱۸۔ مسز ذکیہ مشرف صاحبہ ۔ اسلام آباد	۱۱۰/-	۳۸۰۹
۱۹۔ ایم عبدالکریم صاحب ۔ کلر کہار چکوال	۱۰۰/-	۳۸۱۰
۲۰۔ ملک حنیف وجدانی صاحب ۔ مری	۵۰/-	۳۸۱۱
۲۱۔ محمد ارشاد صاحب ۔ چار ہان مری	۲۵/-	۳۸۱۲
۲۲۔ کلیم اللہ خان صاحب ۔ کینیڈا	۷۹۰۵/۱۴	۳۸۱۳
۲۳۔ ریاض احمد قریشی صاحب معرفت بزم طلوع اسلام ۔ راولپنڈی	۲۵/-	۳۸۱۴
۲۴۔ محمد صادق صاحب " " " " " " "	۵۰۰/-	۳۸۱۵
۲۵۔ چوہدری رحمت اللہ صاحب " " " " " " "	۴۰۰/-	۳۸۱۶
۲۶۔ ملک محمد سلیم صاحب ایڈووکیٹ " " " " " "	۱۰۰/-	۳۸۱۷
۲۷۔ مسز بشریٰ علی صاحبہ ۔ لندن	۲۶۷۳/-	۳۸۱۸
میزان	۲۰۶۶۰/۱۴	روپے
سابقہ میزان	۴،۰۴۸،۷۸۳/۹۸	"
[illegible]	[illegible]	

باسمہٖ تعالیٰ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

پرویز

باسمہٖ تعالیٰ

حُسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

کہا جاتا ہے کہ بعض حقیقتیں افسانوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از قیاس ہوتی ہیں۔ اس کی بیّن مثال خود ہماری اپنی داستان ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ایک قوم اپنے سامنے ایک بلند و بالا، متعیّن، واضح اور روشن نصب العین رکھتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے دس سال تک مسلسل مصروفِ تگ و تاز رہتی ہے۔ اس جدّ و جہد میں ساری دنیا سے لڑائی مول لیتی ہے۔ جانکاہ مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ صبر آزما مصائب جھیلتی ہے۔ لیکن جب دس سال کی اس مسلسل جدّ و جہد کے بعد وہ نصب العین حاصل ہو جاتا ہے تو سوچنے بیٹھتی ہے کہ ہم نے اس کا مطالبہ کیوں کیا تھا؟ اس سے مقصود کیا تھا؟ اس کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ ان سوالات کے ابھارنے والوں میں بعض ایسی شخصیتیں بھی تھیں جو اس جنگ میں خود شریک تھیں۔ ان میں سے کوئی کہتا کہ دراصل ہندوؤں کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں ؎

دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے
بہت مجبور ہو کر ہم نے آئینِ وفا بدلا

یعنی (بقول ان کے) اگر ہندو ذرا بھی کشادہ ظرف ہوتا تو ہم کبھی ہندوستان سے الگ نہ ہوتے۔ بالفاظِ دیگر اگر وہ آج بھی ذرا وسعتِ قلبی کا ثبوت دیں تو ہم ان سے فوراً گلے مل جائیں۔ دوسری طرف سے ...... یہ آواز اٹھی کہ مسئلہ دراصل معاشی تھا۔ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہمارے لئے اس کی گنجائش ہی نہ تھی کہ ہم بڑے بڑے کارخانے لگاتے، عظیم القدر الیوانات تجارت قائم کرتے، بڑی بڑی جائدادیں کھڑی کرتے۔ ہم نے پاکستان اسی مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ یعنی (بقول ان کے) یہ چند سرمایہ داروں اور زرپرستوں کی اسکیم تھی جس کے لئے قوم نے ایسی مہیب جنگ لڑی تھی۔ بعض ایک قدم آگے بڑھے اور یہاں تک کہنے میں بھی نہ کوئی باک سمجھا نہ شرم محسوس کی کہ تقسیمِ ہند درحقیقت انگریز کی اسکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔

حصولِ پاکستان کا مقصد

حصولِ پاکستان سے مقصود کیا تھا اس کے متعلق میں اپنے اس مقالہ میں بڑی تفصیل سے لکھ چکا ہوں جو "نوائے وقت" کی ۷ اراکتوبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا۔ کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟[1] اس میں، مَیں نے مستند حوالوں سے ثابت کیا تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی مملکت کا قیام تھا جس میں قرآنی نظام رائج کیا جا سکے۔ تجدید یادداشت کے لئے میں یہاں قائدِاعظمؒ کے وہ چند الفاظ دہرا دینا کافی سمجھتا ہوں جو انہوں نے ۱۹۴۴ء میں مسلم یونیورسٹی (علیگڑھ) میں ارشاد فرمائے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

> آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبۂ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کے مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے، نہ انگریزوں کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔
>
> (قائدِاعظمؒ کا پیغام مرتبہ سید قاسم محمود صفحہ ۵۲)

جو لوگ تقسیمِ ہند کو انگریزوں کی سکیم قرار دیتے ہیں اور قائدِاعظمؒ کو ان کا آلۂ کار ٹھہراتے ہیں ان کے خبثِ باطن کے علاوہ، ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس جنگ میں ایک طرف انگریزوں جیسی قوم تھی جس کی سلطنت پر (اس کے زمانے میں) سورج تک غروب نہیں ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف ہندو تھا جس کے پاس پرلاؤں اور ٹاٹاؤں کی تجوریاں تھیں۔ جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی زمین دوز دہشت پسند تنظیمات تھیں۔ اُن کے مقابلے میں ایک نحیف و نزار، بے سہارا شخصیت تھی جس کے پاس نہ دولت کے خزانے تھے نہ لاؤ لشکر، نہ خفیہ تنظیمیں تھیں نہ پوشیدہ اسلحہ۔ وہ تنہا بے ساز و یراق یہ جو مکھی لڑائی لڑ رہا تھا۔ اس کے پاس ایک ہی قوت تھی اور وہ تھی عظمتِ کردار کی بے پناہ طاقت۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کی قوت کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم اور اس کے حصول کے لئے پاکیزہ عملِ پیہم۔ چونکہ آج ہماری قوم بدقسمتی سے اس تصوّر ہی سے بیگانہ ہو چکی ہے کہ حُسنِ کردار کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے اور اس سے بے ساز و سامان کیسے کیسے محیر العقول کارنامے ظہور میں آ سکتے ہیں، اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ حصولِ پاکستان کا راز اس معمارِ پاکستان کے یقینِ محکم، عزمِ بلند اور بے لوث کردار میں مضمر تھا۔ میں صحبتِ امروزہ میں اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی کوشش کروں گا، بالخصوص اس اعتراض کی تردید کہ تقسیمِ ہند کی سکیم انگریز کے ذہن کی اختراع تھی اور قائدِاعظمؒ اس کے اس مقصد کے حصول کے آلۂ کار تھے۔

جہاں تک کردار کی عظمت (یعنی کیریکٹر کی بلندی اور پاکیزگی) کا تعلق ہے، اس ضمن میں ایک بنیادی نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے اور وہ یہ کہ نام و نمود کے خواہاں لوگ جب اپنی شہرت کے عروج پر پہنچ جائیں تو وہ اپنی

---

[1] یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے اور پمفلٹ کی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔

گفتار و کردار کے بارے میں خاص احتیاط برتتے ہیں کہ ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جس سے ان کی شہرت داغ دار ہو جائے۔ لہٰذا، ان کے اس زمانے کے اعمال و افعال، کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ نہیں بن سکتے۔ کیریکٹر ماپنے کا پیمانہ کسی کے اس زمانے کے احوال و کوائف ہوتے ہیں جب اُس نے ہنوز کوئی مقامِ بلند حاصل نہ کیا ہو، اور وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہو۔ وہ اس زمانے میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہے، اس میں تصنع اور آورد نہیں ہوتی۔ اس لئے ان میں اس کے جوہرِ کردار کی حقیقی جھلک دکھائی دے سکتی ہے ——— یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ نبی اکرمؐ سے مخالفین نے پوچھا کہ اس کی شہادت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپؐ نے فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

میں نے اعلانِ نبوت سے پہلے، جب میری حیثیت معاشرہ کے ایک عام فرد کی سی تھی، تمہارے اندر زندگی گذاری ہے، میرے اس زمانے کے کردار کو سامنے لاؤ اور پھر سوچو کہ اس قسم کا کردار ایک سچے انسان کا ہوتا ہے یا جھوٹے آدمی کا!

حضورؐ کے اس جواب نے (جو بزبانِ وحی دیا گیا تھا) ہمارے سامنے کردار کے ماپنے کا صحیح پیمانہ رکھ دیا ہے۔ میں اسی پیمانے کے مطابق، قائدِ اعظمؒ کے کردار کی داستان، ان کی زندگی کے اس ابتدائی دور سے شروع کروں گا جب انہیں ہنوز ملک گیر شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ آغازِ سخن ۱۹۱۸ء سے کیا جاتا ہے۔ جب "مانٹیگو، چمسفورڈ سکیم" کے سلسلہ میں، اس زمانے کے وزیرِ ہند، مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ انہوں نے اس وقت کے چوٹی کے لیڈروں، تلک، گوکھلے، دادا بھائی نوروجی کے علاوہ، مسٹر محمد علی جناحؒ سے بھی ملاقات کی اور اپنی ڈائری میں اس جوان سال سیاست دان کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلم بند کئے:

ایک صاف ستھرا، انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی۔ وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ میں اس سے باتیں کر کے ہار گیا۔ لارڈ چمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی، لیکن جناحؒ کی قوتِ استدلال نے اسے پوری طرح اُلجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے۔ اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناحؒ جیسے انسان کو بھی نظامِ مملکت میں دخل حاصل نہ ہو۔

لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد، مسٹر جناحؒ نے بمبئی میں پریکٹس شروع کی تو حالات سخت نامساعد تھے اور زمانہ انتہائی مشکلات کا۔ لیکن اس پر بھی بساطِ روزگار پر اس نوواردِ کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ عدلیہ کے سربراہ سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے ممتاز منصب کی پیش کش کی جس کا مشاہرہ اُس زمانے میں پندرہ سو روپے تھا، تو مسٹر جناحؒ نے اس پیش کش کو شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے مسترد کر دیا کہ میں کم از کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔ سر چارلس اسے ایک مجذوب کی بڑ قرار دے کر مسکرا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس نے دیکھ لیا کہ یہ مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ ایک باخود خزیدہ نوجوان کی

خود اعتمادی کا مظاہرہ تھا جو حقیقت بن کر رہا۔

(۰)

یہ پہلی جنگِ عظیم کے آخری دور کی بات ہے اس جنگ میں گو اتحادیوں کو یہ ہیئتِ مجموعی کامیابی حاصل ہو رہی تھی لیکن ان جراحت ہائے پیہم سے برطانیہ کی حالت بسمل کی سی ہو رہی تھی اور حکومت اس قدر ذکی الحس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے خلاف ذرا سی تنقید بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ لارڈ ہارڈنگ برطانوی پارلیمنٹ میں یہ کہہ بیٹھا کہ ہم، انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو دعوت دیتے ہیں کہ حکومتِ ہند کے خلاف آزادانہ تنقید کریں۔ جناحؒ کو ایسا موقع خدا دے، وہ اس زمانے میں مسز اینی بسینٹ کی قائم کردہ، ہوم رول لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کی جس میں پہلے اہلِ ہند کی ان بے مثال قربانیوں کا ذکر کیا جو انہوں نے جنگ کے سلسلہ میں دی تھیں۔ اس کے بعد کہا:-

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستانیوں سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون بہانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں! آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے..... یہ جنگ، آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا اربابِ حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے! یاد رکھئے کہ یہ انداز حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔

مسٹر جناحؒ کے اس نعرۂ حریت کا اثر تھا کہ وزیرِ ہند کو دارالعوام میں اعلان کرنا پڑا کہ

> ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں اور رفتہ رفتہ حکومتِ برطانیہ کے اس حصے میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد رکھی جائے۔

یہ آزادیٔ ہند کی عمارت کی پہلی اینٹ تھی جو قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

وزیرِ ہند نے تو حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کا اعلان کر دیا لیکن ہندوستان میں ایسے سر پھرے انگریز حکمران تھے جو نشۂ قوت میں بدمست، اس تصور تک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اہلِ ہند کو کچھ سیاسی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ ان میں لارڈ سیڈنہم اور لارڈ ولنگڈن کا نام سرِ فہرست آتا تھا جو یکے بعد دیگرے، اس صوبۂ بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے جو جناحؒ کا مسکن تھا۔ جناحؒ نے ان دونوں سے جس بے باکانہ انداز سے ٹکر لی وہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ کا نہایت ولولہ انگیز باب ہے۔

لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے، تو یہ سرمستِ بادۂ حریت، بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے گرجا اور لارڈ سیڈنہم کا نام لے کر کہا کہ

> یہی ہے وہ رجعت پسند جس نے ایک عرصہ تک ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول

ہیں۔ اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہ نمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعثِ فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

اس دَور میں جرأت و بے باکی کی اس قسم کی مثال بہت کم ملے گی۔ اس کے بعد لارڈ ولنگڈن کی باری آئی۔ اس جابر حکمران نے مسلم لیگ کے اجلاس کو ناکام بنانے کی نہایت مکروہ سازش کی تھی اور جناحؒ کو اس کا علم تھا۔ جب وہ ہندوستان سے رخصت ہونے لگا تو خوشامد پسندوں کے ایک گروہ نے ٹاؤن ہال میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں اہالیانِ شہر کی طرف سے اس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے کا پروگرام تھا۔ مسٹر جناحؒ انتہائی جرأت و بسالت سے اس جلسہ میں جا پہنچے، لیکن پولیس نے انہیں وہاں سے نکال دیا۔ وہ ہال سے باہر آئے تو وہاں ہزاروں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ مسٹر جناحؒ نے وہاں جو شعلہ انگیز تقریر کی، اس نے فضا میں ایسا تہلکہ مچا دیا کہ ٹاؤن ہال کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اس بے مثال کامیابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے سامعین سے کہا کہ

> آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کا یہ دن، بمبئی کی تاریخ میں جشنِ مسرت کا دن ہے۔ جائیے اور خوشیاں منائیے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

اہلِ بمبئی نے یہ جشن اس انداز سے منایا کہ وہاں جناحؒ میموریل ہال کا سنگِ بنیاد رکھ دیا جو آج تک اس بطلِ حریت کے جذبۂ بے باکی کی یاد تازہ کرنے کا محسوس محرک ہے۔ اس میموریل کے قیام کے سلسلہ میں، ایک ہندو لیڈر مسٹر بی۔ جی۔ لاٹم نے جو اپیل شائع کی تھی اس کے یہ الفاظ ایک درخشندہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ اس نے کہا تھا:۔

> کوئی شخص اگر "میموریل" کا مستحق ہے تو وہ صرف مسٹر جناحؒ ہیں، جن کی بلند حوصلگی اور بے خوف قیادت نے قومی زندگی میں حقیقتاً ایک نئے دَور کا آغاز کر دیا ہے۔ مسٹر جناحؒ کے عزمِ صمیم میں ہمارے مرحوم لیڈروں، دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کی رُوح جلوہ گر نظر آتی ہے.......انہوں نے عوام کے حقوق کی راہ نمائی کی ہے اور ایک عظیم المرتبت محبِ وطن کی حیثیت سے، ان کا نام ہمیشہ کے لئے دلوں میں تر و تازہ رہے گا.....مسٹر جناحؒ ہر اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور ایک میموریل کے بجا طور پر مستحق ہیں!

یہ واقعہ تو لارڈ ولنگڈن کے رخصت کے وقت کا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں بھی، مسٹر جناحؒ نے اس کے ہر غلط اقدام کی اس شدت اور سختی سے مخالفت کی جس کی اس زمانہ میں، شاید ہی کوئی اور جرأت کر سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، وہ زمانہ جنگ کا تھا جس میں انگریز اپنے خلاف خفیف سے خفیف تنقیدی آواز کو بھی

استبداد کے آہنی شکنجہ سے دبا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ لارڈ ولنگڈن نے صوبائی وار کانفرنس کا اجلاس طلب کیا جس میں مسٹر جناحؒ کو بھی، ہوم رول لیگ کے نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کیا۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے ایڈریس میں، اہل ہند سے جنگ میں عملی تعاون کی اپیل کی، لیکن اس کے ساتھ ہی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کی نیت پر حملہ بھی کر دیا۔ اس کے ایڈریس کے فوری بعد مسٹر جناحؒ اسٹیج پر آئے اور اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:۔

> مرحلہ کتنا ہی نازک کیوں نہ ہو ہر ہندوستانی اس پر متفق ہے کہ ہندوستان کو سیاسی میدان میں آگے بڑھنا چاہیئے۔ قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں اس قلبی اذیت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ.... ہز ایکسیلینسی ہوم رول لیگ کے رہنماؤں کے خلوص و صداقت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس طرز کلام اور روش پر انتہائی افسوس ہے۔ اور ایکسیلینسی کے احترام کے باوجود میں اس طرز عمل کے خلاف اظہار احتجاج کرتا ہوں۔ ہم اپنے ملک کے دفاع کے لئے بے چین ہیں — لیکن مشکل یہ ہے کہ حکومت سپاہیوں کی بھرتی چاہتی ہے اور ہم "نیشنل آرمی" کا قیام چاہتے ہیں۔ یہی فرق ہے ہم دونوں میں۔ ہمارے نزدیک "جرمن خطرہ" سپاہی دور نہیں کر سکتے۔ یہ صرف نیشنل آرمی کر سکتی ہے۔ ہم اس وقت تک حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک ہمیں اعتماد میں نہ لیا جائے اور شریک کار نہ بنایا جائے۔

مسٹر جناحؒ تو ان جذبات کا اظہار کر رہے تھے، اور دوسری طرف مسٹر گاندھی، جنہیں آزادی کا اوتار کہہ کر پکارا جاتا ہے، کی کیفیت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست کی معرفت، وائسرائے کو ایک خط بھیجا، جس میں لکھا کہ

> میں اپنے ملک والوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ تحریک آزادی کے سلسلہ میں اپنے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹا لیں۔ میں کانگریس کے تمام ریزولیوشنز واپس لینے کا مشورہ دوں گا اور دوران جنگ میں ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا نام بھی نہ لوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ مادر ہند کا ہر تندرست سپوت سلطنت کی حرمت پر کٹ مرے۔

مسٹر جناحؒ نے حکومت برطانیہ کی اس پالیسی کے خلاف، صرف وار کونسل کی اس کانفرنس میں تقریر نہیں کی۔ وہ مختلف مواقع پر اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے اور آخر کار انہوں نے وار کونسل سے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا۔ یہ استعفےٰ جس خط کے ساتھ بھیجا گیا وہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں منفرد دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ

> حکومت ہند نے اور آپ نے زمانہ امن میں ایک ایسی چیز کو رجسٹر قوانین میں شامل کرنا مناسب سمجھا ہے جو حقیقتاً نفرت انگیز اور بلا خوف تردید تشدد آمیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بل پاس کر کے آپ کی حکومت نے اس تمام استدلال پر خط تنسیخ کھینچ دیا ہے جو جنگ کانفرنس میں مدد کے لئے ہندوستانیوں سے اپیل کرتے وقت پیش کیا گیا تھا۔ آپ نے ان تمام اصولوں کو پاؤں تلے

روندڈالا ہے، جن کے لئے حکومت برطانیہ نے جنگ لڑی تھی ـــــ انصاف کے بنیادی اصولوں کا جس اس وقت استیصال کیا گیا ہے اور عوام کے آئینی حقوق پر عین اس وقت ڈاکہ ڈالا گیا ہے جب حکومت کو حقیقتاً کسی بھی خطرے کا سامنا نہیں ـــــ ان حالات کے درمیان میں اپنے رائے دہندگان کے لئے کونسل میں ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا ہوں۔ علاوہ بریں ایک ایسے شخص کے لئے جو عزتِ نفس کا احساس رکھتا ہو، ایک ایسی حکومت کے ساتھ جو عوام کے نمائندوں کی رائے کو نہ تو کونسل میں کوئی اہمیت دیتی ہو اور نہ ہی اُسے عوام کے جذبات کا کوئی احترام ملحوظ ہو، تعاون کرنا امرِ محال ہے ـــــ میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانہ امن میں ایسے قوانین پاس کرتی ہے مہذب حکومت کہلانے کی مستحق نہیں۔

جنگ کے خاتمہ پر، حکومتِ برطانیہ نے اہلِ ہند کے تعاون کا صلہ اس رسوائے زمانہ رولٹ ایکٹ کی شکل میں دیا جس کی رُو سے، امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہزاروں محبوس انسانوں کا قتل، ہلاکو اور چنگیز کی وحشت انگیزیوں اور خونریزیوں کی داستانوں کو فراموش کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس قیامت خیز المیہ کے متعلق بیان دیتے ہوئے مسٹر جناحؒ نے کہا:۔

رسوائے عالم رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پہ لارڈ چیمسفورڈ کی حکومت نے عمل درآمد شروع کیا ہے، ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے اشکوں کی روانی دھو سکتی ہے۔ انہیں اپنے اس فیصلے کی قیمت آج نہیں تو کل ضرور ادا کرنی پڑے گی۔ کم از کم ایک بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ موجودہ طرزِ حکومت ناقابلِ برداشت ہے اور اس کی جگہ ایک مکمل ذمہ دار حکومت ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوں گے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کو احتجاجی ریزولیوشن بھیجنے کے بجائے کوئی مؤثر لائحہ عمل وضع کرنا ہوگا۔ یقیناً ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے جو فرانس، اٹلی اور مصر میں بروئے کار لائے گئے ہیں۔

اسی قسم کے تھے مسٹر جناحؒ کے جذباتِ تہور اور آزادی کے وہ مظاہر، جن سے متاثر ہو کر مسٹر گوکھلے جیسے عظیم ہندو راہنما نے کہا تھا کہ

ہندوستان کو جب بھی، آزادی نصیب ہوئی، وہ جناحؒ ہی کی بدولت ہوگی۔

مسٹر جناحؒ کے اس بے لوث کردار کی بنا پر، لوگوں کے دلوں میں ان کا کس قدر احترام تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگ سکتا ہے۔ وہ کانگریس سے الگ ہو چکے تھے اور اس کے مسلک کے مخالف تھے۔ اس دوران میں، وہ مرکزی کونسل کی رکنیت کے لئے آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مدِمقابل کانگریس کا امیدوار تھا۔ "بمبئی کرانیکل" چوٹی کا نیشنل روزنامہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ووٹروں سے مسٹر جناحؒ کے حق میں اپیل کی اور کہا کہ

ان کی گزشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبۂ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں اور نہ کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرأت کر سکتا ہے ــــ علاوہ بریں جناح ؒ کے ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت بڑا امتیازی مقام عطا کر دیا ہے ــــ اگر معمولی اختلاف کی بنا پر جناح ؒ جیسے قائد کو ملکی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا تو یہ ایک ناقابلِ فراموش ذلت کا ارتکاب ہوگا۔

قائدِ اعظم ؒ نے کوئی انتخابی مہم شروع نہ کی لیکن ان کے ہندو دوستوں نے از خود قریب ایک سو ووٹیں فراہم کر دیں اور وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

اس وقت تک ہم مسٹر جناح ؒ کی زندگی کے اس حصہ سے متعلق گفتگو کر رہے تھے جب وہ ہندوستان کی قومی سیاست کے لیڈر تھے۔ اب ہم اس وادی میں داخل ہوتے ہیں جہاں وہ ملّتِ اسلامیہ کے قائد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں سر آغازِ داستان اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ سیاست عالم کا موجودہ دور، میکیاولی کہلاتا ہے۔ جس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرنا جائز ہے۔ لہٰذا اس سیاست میں جھوٹ، فریب، مکاری، عیاری، وعدہ فراموشی، پیمان شکنی وغیرہ سب جائز قرار پاجاتے ہیں۔ جو جس قدر شاطر اور چالباز ہو، وہ اسی قدر کامیاب اور نامور لیڈر مانا جاتا ہے اور قوم اس کے مجسّمے نصب کرتی ہے۔ اس وادیٔ پُرخار میں قائدِ اعظم ؒ کے مدِّمقابل انگریز، ہندو اور تحریکِ پاکستان کے مخالف مسلمان سب "متحدہ محاذ" بنائے ہوئے تھے۔ میکیاولی سیاست میں انگریز تو استاد کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن ہندو، اور (نام نہاد) مسلمان سیاسی لیڈر بھی اس باب میں اس سے پیچھے نہ تھے۔ مسٹر سری پرکاش، ۱۹۴۸ء میں، پاکستان میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۳ نومبر کی شام، کراچی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا:-

> کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے، لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کرنا چاہئے کہ ہندومت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقعہ پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا۔ اس لئے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزاروں سال مختلف حالات اور متبائن ماحول میں زندہ رہا اور زندہ رہے گا۔

اس ہندومت کا سب سے بڑا نمائندہ مسٹر گاندھی تھا۔ جسے اس کی قوم "مہاتما" کہتی، اور ایشور کا اوتار مانتی تھی۔ اس "مہاتما" کے متعلق قائدِ اعظم ؒ نے فرمایا تھا کہ

> ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفید مطلب ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان

کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو اُن کا مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جیب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو "اندرونی آواز" کو بلا لیتے ہیں۔ کہئیے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیستاں ہیں، معمّہ ہیں۔

بہرحال، یہ تھے وہ حریف جن سے قائدِ اعظمؒ کو واسطہ پڑا تھا۔ ان کا یہ دس سالہ دورِ سیاست بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔ اپنے تو ایک طرف، ان کے کسی بد سے بدتر دشمن کو بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ انہوں نے کسی معاملہ میں جھوٹ بولا یا فریب دیا ہو، وعدہ خلافی کی ہو یا بات کر کے مکر گئے ہوں۔ صاف، سیدھی دو ٹوک بات اور پھر اس پر چٹان کی طرح قائم۔ یہی تھی ان کی وہ خصوصیتِ کبریٰ جس پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے، دنیا کے مشہور ترین اخبار — لندن ٹائمز — نے ان کی وفات پر لکھا تھا کہ

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لوچ نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

دیانتدارانہ سیاست

لندن ٹائمز کے ان ریمارکس کی تائید میں قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے بے شمار واقعات پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف دو ایک پر اکتفا کروں گا۔ مسٹر اصفہانی نے اپنی کتاب (QUAID-E-AZAM, JINNAH, AS I KNOW HIM.) میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کی ایک نشست خالی ہوئی۔ اس کے لئے مسٹر اصفہانی بطور مسلم لیگی امیدوار کھڑے ہوئے۔ انتخاب بلامقابلہ ہو رہا تھا کہ تاریخِ نامزدگی سے دو دن پہلے، بالکل خلافِ توقع، ایک اور صاحب نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ اس زمانے میں انتخاب کے معنی محض ایک آدھ نشست حاصل کر لینا نہیں تھا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کے دعویٰ کا ثبوت بہم پہنچتا تھا۔ اس لحاظ سے فریقِ مقابل کا یوں سامنے آ جانا وجہ پریشانی ہو گیا۔ ایک شام (محترم) عبدالرحمان صدیقی بھاگے بھاگے آئے اور اصفہانی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ انہوں نے فریقِ مخالف کو اس پر رضامند کر لیا ہے کہ اگر ہم اس کے زرِ ضمانت کا مبلغ اڑھائی سو روپیہ ادا کر دیں تو وہ مقابلہ سے دستبردار ہو جائے گا۔ ہم اس سے بہت خوش ہوئے۔ قائدِ اعظمؒ ہم سے ذرا فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ان کے کان میں بھنک سی پڑی تو انہوں نے صدیقی صاحب سے کہا کہ ذرا اپنی بات کو دہرائیں۔ انہوں نے بات سنائی تو قائدِ اعظمؒ نے سخت برافروختہ ہو کر کہا کہ

> تم نے کیا کہا ہے؟ پیسے دے کر فریقِ مخالف کو بٹھا دینا! یہ بالواسطہ رشوت نہیں تو اور

کیا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ جاؤ! اور اس سے کہو کہ ہمیں یہ منظور نہیں۔ ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی قائدِ اعظمؒ نے جو اصول بیان فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ دورِ حاضرہ کی میکیاولی سیاست میں اخلاق کے دو ضابطے ہیں۔ پرائیویٹ زندگی کے لئے اور ضابطہ۔ پبلک زندگی کے لئے اور۔ پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں:۔

(دورِ حاضرہ کی سیاست میں) پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور ہے اور امورِ مملکت کے لئے ضابطہ کچھ اور۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنی نجی زندگی میں دیانت دار، رحم دل اور قابلِ اعتماد ہیں، ان کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ جب انہیں اپنی مملکت کے نمائندہ کی حیثیت سے دوسری مملکت کے نمائندوں سے معاملہ کرنا ہو تو وہاں وہ سب کچھ کر گزرنا "کارِ ثواب" سمجھیں گے جسے وہ اپنی نجی زندگی میں نہایت شرمناک تصور کرتے تھے۔

(GUIDE TO MORALS, P. 130)

اور اسی بنا پر اٹلی کے مشہور مدبر (CAVOUR) نے کہا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔ (انسان نے کیا سوچا؟ صفحہ ۲۳۵)

قائدِ اعظمؒ بھی اسی دور کے سیاستدان تھے اور ان کے فریقِ مقابل بھی اسی سیاست کی بساط بچھائے ہوئے تھے۔ لیکن دیکھئے کہ ان کے اصولِ سیاست کیا تھے۔ انہوں نے مسٹر اصفہانی سے کہا: "میرے عزیز! یاد رکھو۔ پبلک زندگی میں اخلاقی دیانت پرائیویٹ زندگی سے بھی زیادہ اہم ہے۔ (پرائیویٹ زندگی میں بددیانتی سے کسی ایک شخص کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن) پبلک زندگی میں بددیانتی سے لاتعداد لوگ مجروح ہوتے ہیں اور اس سے ہزارہا ایسے لوگ بے راہرو ہو جاتے ہیں، جن کا آپ پر اعتماد ہوتا ہے۔"

مسٹر اصفہانی لکھتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانتداری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانتدار ہونا انسانیت کا تقاضا ہے، اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟ بالفاظِ دیگر جو دیانتدار نہیں، وہ انسان ہی نہیں۔

(۰)

کلکتہ کے انتخاب سے کہیں زیادہ اہم ایک اور انتخابی مہم درپیش تھی۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ وزارتیں قائم کرنے کا سوال درپیش تھا۔ ۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفےٰ دیا تو گورنر نے نواب ممدوٹ سے تشکیلِ وزارت کے لئے کہا۔ عددی اعتبار سے یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلم لیگ اپنے ساتھ کچھ غیر مسلم اراکین کو ملا کر وزارت قائم کرتی۔ قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس وقت ایسا کر لیں اور جب

آہستہ آہستہ مسلم لیگ طاقت پکڑ جائے تو پھر ان دوسرے ممبروں سے نپٹ لیا جائے۔ قائداعظمؒ اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور تجویز پیش کرنے والے سے کہا کہ

آپ کان کھول کر سن لیجئے کہ میں اس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو، میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا اور یہی نظریہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہے۔

اس پر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ نواب ممدوٹ نے وزارت تشکیل کرنے سے انکار کر دیا اور گورنر نے پنجاب میں آرٹیکل ۹۳ نافذ کر دی۔ چند ہی مہینوں کے بعد پاکستان وجود میں آ گیا اور نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی ——— (ماہنامہ المعارف لاہور۔ بابت نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء حصہ انگریزی۔ صفحہ ۳) ؎

مسلم لیگ فنڈ

ابھی ابھی ہم نے دیکھا ہے کہ قائداعظمؒ نے فرمایا تھا کہ جو شخص دیانتدار نہیں وہ انسان ہی نہیں۔ دیانتداری کی سب سے بڑی کسوٹی روپیہ ہے۔ ہماری بڑی بڑی انجمنوں، تنظیموں، جماعتوں اور معتبر شخصیتوں کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ قائداعظمؒ کو اس ذمہ داری کا ایسا شدید احساس تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کے لئے فنڈ کی اپیل کی تو ہر روز سینکڑوں منی آرڈروں پر خود دستخط کرتے تھے۔ آپ سوچئے کہ قائداعظمؒ جیسے مصروف اور نحیف و نزار شخص کے لئے ہر روز اتنی تعداد میں منی آرڈروں پر دستخط کرنا کس قدر دوبھر تھا۔ لیکن وہ خوشی خوشی ایسا کرتے۔ وہ بار بار اپنی انگلیوں کو سہلاتے اور پھر دستخط کرنا شروع کر دیتے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا ہے تو فرماتے کہ "فنڈ کی اپیل میں نے کی ہے۔ لوگ میرے اعتماد پر پیسے بھیجتے ہیں۔ مجھے ایک ایک پیسے کا حساب

؎ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۴ جنوری ۱۹۸۱ء میں ایک صاحب کا خط چھپا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ممدوٹ وزارت کا قصہ اس طرح نہیں تھا جس طرح المعارف میں لکھا گیا ہے چیف جسٹس (ریٹائرڈ) محمد منیر صاحب نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد شدہ قائداعظم سیمینار میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس میں قائداعظمؒ کی اصول پرستی کی تائید میں یہ واقعہ درج کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ بعد میں المعارف میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا فیصلہ محترم جسٹس منیر اور مراسلہ نگار ہی کر سکتے ہیں کہ کس کا بیان واقعہ کے مطابق ہے، مراسلہ نگار نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔

جیسا کہ پرویز صاحب نے متعدد بار کہا ہے یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت تک نہ تو تحریک پاکستان کے متعلق کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی کوئی قابل اعتماد سوانح حیات، ان حالات میں واقعات کی جزئیات میں اختلاف ممکنات میں سے ہے۔

لیکن اصل سوال قائداعظمؒ کی اصول پرستی کا ہے جس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ (طلوع اسلام)

دینا ہوگا۔ اس لئے رسیدیں مجھے ہی دینی چاہئیں"
آپ اس جواب کے آخری الفاظ پر غور فرمایئے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ "مجھے ایک ایک پیسے کا حساب دینا ہوگا" ظاہر ہے کہ قائدِ اعظمؒ سے حساب مانگنے والا کون ہو سکتا تھا؟ اس لئے اس سے مطلب یہ تھا کہ مجھے ان کے پیسوں کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا۔ اور یہی ہے دیانتدار ہونے کے لئے بنیادی راز۔ جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ مجھے ایک ایک پائی کا خدا کے ہاں حساب دینا ہوگا، وہ بددیانت ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ خدا پوچھے گا کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ قائدِ اعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے سرکاری مکان میں رہائش پذیر ہو گئے تو ان کی یہ روش تھی کہ جس کمرے میں روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اس کمرے کا بلب خود بجھا دیتے۔ اور مختلف کمروں میں چلتے پھرتے تو بلب جلانے اور بجھانے کا عمل متواتر ساتھ ساتھ چلتا۔ وہ کہا کرتے کہ

> اسراف گناہ ہے۔ اور اگر وہ روپیہ قوم کا ہے تو اس میں اسراف گناہِ عظیم ہے۔
> (اصفہانی ۱۲۵)

یہ تھا قائدِ اعظمؒ کا کردار! انہوں نے مسلم لیگ کنونشن (۱۹۴۶ء) کی افتتاحی تقریر میں اس سوال کے جواب میں کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں، فرمایا تھا:۔

> عزتِ نفس۔ دیانت۔ امانت۔ یقینِ محکم اور قومی مفاد کی خاطر، اپنے آپ کو محو کر دینے کے لئے ہر وقت آمادگی۔ ان امتیازات کی شدتِ احساس کو کیریکٹر کہا جاتا ہے۔

یہی تھا قائدِ اعظمؒ کا وہ کردارِ بلند جس کے اعتراف میں "دی گریٹ ٹریولڈ" کے مصنف "ایچ وی ہڈسن" نے لکھا تھا کہ

> قائدِ اعظمؒ کے بڑے سے بڑے سیاسی حریف نے بھی کبھی ان کے خلاف، بددیانتی، یا مفاد پرستی کا الزام عائد نہیں کیا تھا۔ انہیں کوئی شخص، کسی قیمت پر بھی خرید نہیں سکتا تھا۔ نہ ہی وہ مرغِ باد نما تھے جو شہرت عطا کرنے والی ہواؤں کے ساتھ اپنا رخِ کردار بدل لیتے یا وقتی مفادات کی خاطر اپنے سیاسی اصولوں میں تبدیلی کرتے۔ وہ اصولوں کی پابندی میں چٹان کی طرح سخت اور بلند ترین۔ عزتِ نفس و حمیت کے پیکر تھے۔
> (تخلیقِ پاکستان۔ انگریزی۔ از جمیل الدین احمد۔ صفحہ ۲۶۶)

علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ ان پر ٹھیک ٹھیک صادق آتے ہیں ؎

وہی ہے بندۂ حُر ضرب ہے جس کی ہے کاری — نہ وہ کہ ضرب ہے جس کی تمام عیاری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے — انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

اور اس سے ہماری نگاہ کا رُخ، اقبالؒ جیسے حکیم الامت کی نظرِ انتخاب کی طرف پلٹتا ہے۔ مسٹر جناحؒ ہندی سیاست

کی بوالعجبیوں سے دل برداشتہ ہو کر، گوشہ نشین ہو چکے تھے، دوسری طرف ہندوستان میں، انگریز اور ہندو کی ملی بھگت ایسے منصوبے بنا رہی تھی جس سے اس ملک میں مسلمانوں کا جداگانہ تشخص تک باقی نہ رہے۔ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں پہنچ چکے تھے اور مسلمانوں کے مستقبل کے احساس سے وہ خون کے آنسو روتے تھے۔ انہیں مسلمان لیڈروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اس قوم کی کشتی کو ان طوفانوں سے بچا کر سلامتی کے ساحل کی طرف لے جائے۔ لیکن اقبالؒ تو دیدہ ور تھا، اس لئے اس کی نگاہ، سطح سے نیچے اتر کر گہرائیوں تک جا پہنچی اور وہاں سے اسے وہ گہر تابدار مل گیا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں پھر رہا تھا۔ انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو محمد علی جناحؒ کو ایک خط لکھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حیاتِ قائدِ اعظمؒ کے احوال و کوائف کے متعلق کوئی اور دستاویز باقی نہ بھی رہے تو صرف یہ ایک خط ان کی عظمتِ کردار اور بلندیٔ مقام کی بیّن شہادت قرار پانے کے لئے کافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبالؒ نے اپنے اس خط میں لکھا:۔

> میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا (میرے اس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

اس مکتوبِ گرامی سے جہاں ایک طرف قائدِ اعظمؒ کی عظمتِ کردار، نیّرِ درخشاں کی طرح عالمتاب ہو جاتی ہے، دوسری طرف وہ، حکیم الامتؒ کی دیدہ وری کی بھی بیّن شہادت بن جاتا ہے کہ انہوں نے کن حالات میں، کس شخص کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا۔ اور آنے والے واقعات نے اسے کس قدر صحیح کر دکھایا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھے تھے۔ اس دوست نے علامہؒ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے انہیں لکھا تھا:۔

> میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں، پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور کمال اتاترک کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔ (نوائے وقت ۹ مارچ ۱۹۷۷ء)

اور اب ٹیپ کا بند سنیئے۔ قائدِ اعظمؒ نے ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یومِ اقبالؒ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

> اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہا اور اس وقت مجھ سے کہا گیا کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیسِ اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف اقبالؒ کی تصنیفات ہیں، تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو، تو میں اقبالؒ کی

تصانیف کو ترجیح دوں گا۔ (ذکرِ اقبالؒ عبدالمجید سالکؒ۔ صفحہ ۲۲۶)

عام لیڈروں کی سب سے بڑی خواہش سستی شہرت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس کے لئے وہ کون کون سے ہتھکنڈے اور کس کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں، اس کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، یہ ہم سب کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ لیکن قائدِاعظمؒ تو کسی اور ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ انہیں اپنی ذات پر کس قدر اعتماد تھا اور سستی شہرت حاصل کرنے سے کس قدر نفرت، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کافی سمجھتا ہوں، جو ہے تو معمولی سا، لیکن اس میں حقیقت بہت بڑی پنہاں ہے۔ مسٹر جناحؒ اسمبلی سیشن کے سلسلہ میں گرمیوں میں اکثر شملہ تشریف لایا کرتے تھے، لیکن جب وہ قائدِاعظمؒ کی حیثیت سے پہلی بار شملہ آئے تو مسلمانانِ شملہ نے ان کے لئے تاریخی جلوس نکالنے کا فیصلہ اور اہتمام کیا۔ ریلوے سٹیشن سے وہ ایک کھلے رکشا میں سوار ہوئے کہ وہاں اسی سواری کی اجازت تھی، اور مال روڈ سے آگے بڑھے۔ مال روڈ پر تو سرکاری دفاتر تھے لیکن آگے جاکر ایک راستہ لوئر بازار کی طرف اترتا تھا جہاں عوام کی آبادی تھی اور وہ ان کے انتظار میں چشم براہ تھے۔ قائدِاعظمؒ انگریزی لباس میں ملبوس تھے جو ان کا اس زمانے کا معمول تھا۔ اور ان کا سفید رنگ کا بڑا سا "ٹوپ" ان کے زانوؤں پر دھرا تھا۔ اس زمانے میں، انگریز دشمنی کی بنا پر، انگریزی ٹوپی کو بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس مقام پر بعض دوستوں کے دل میں یہ خیال ابھرا کہ لوئر بازار کے مسلمان اپنے ملّی راہ نما کو پہلی بار دیکھیں گے۔ وہ متوقع ہوں گے کہ یہ راہ نما "اسلامی لباس" میں ملبوس ہوگا ——— اسلامی لباس سے اس زمانے میں مراد شیروانی، شلوار یا پاجامہ اور ترکی ٹوپی تھی۔ وہ جب انہیں اس لباس میں دیکھیں گے تو ان پر کچھ اچھا اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اس وقت اس سلسلہ میں ہو کیا سکتا تھا۔ بعض احباب نے کہا کہ اور کچھ نہیں تو جناحؒ صاحب سے کہا جائے کہ وہ کم از کم اپنے "ٹوپ" کو نیچے رکھ لیں تاکہ وہ نمایاں طور پر دکھائی نہ دے۔ اس جرأت مندانہ اقدام کے لئے قرعۂ فال مجھ دیوانے پر پڑا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے قائدِاعظمؒ سے شرفِ نیاز حاصل تھا۔ وقت کی کمی، اور جذبات کی شدت کی وجہ سے میں نے بھی اس اقدام کی نزاکت پر غور نہ کیا اور آگے بڑھ کر، قائدِاعظمؒ کے کان میں یہ بات کہی۔ انہوں نے اسے سنا، اور اگرچہ میں نے محسوس کیا کہ انہیں یہ مشورہ خوش نہیں آیا، انہوں نے اپنے مخصوص مشفقانہ انداز سے، میرے کان میں جو کچھ کہا اس کا ملخص یہ تھا کہ "کیا تم لوگ مجھے مہاتما گاندھی بنا دینا چاہتے ہو۔ جناحؒ ان سطحی حربوں سے پاپولر نہیں بننا چاہتا۔ اگر اس میں خلوص اور خدمت کی جاذبیت ہوگی تو یہ خود بخود مقبولِ انام ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو اس طرح حاصل کی ہوئی ہر دلعزیزی بڑی ناپائدار ہوگی۔ ویسے ممکن تھا کہ میں اس ٹوپی کو نیچے رکھ دیتا۔ لیکن اب ایسا کرنا منافقت ہوگی جس کی کم از کم مجھ سے توقع نہ رکھو۔" یہ کہا اور اس ٹوپ کو زانوؤں سے اٹھا کر زیبِ سر کر لیا۔ اور اسی ہیئت سے جلوس کے راستوں سے گزرے۔

(۰)

اب "مہاتما" کی زندگی کی بھی ایک جھلک دیکھتے جایئے جس کی طرف قائدِاعظمؒ نے اشارہ کیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم

ہوگا وہ ایک دھوتی پہنے، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے اور دہلی میں بھنگی کالونی میں قیام پذیر ہوتے تھے تاکہ وہ عوام کے لیڈر بن سکیں۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک انٹرویو اخبارات میں شائع ہوا تھا، جس میں اس نے تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں اپنے بعض مشاہدات اور واقعات کا ذکر کیا تھا۔ اس ضمن میں اس نے کہا تھا کہ اس نے ایک دن مسز سروجنی نیڈو سے کہا کہ

میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں، اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لئے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں؟

اس کے جواب میں مسز نیڈو نے کہا کہ

ہم ان کے لئے ریل کے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کراتے ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں، جنہیں ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے، انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس "بوڑھے" کو اس طرح مفلسی اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لئے کانگرس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔

بہرحال، یہ تھا قائدِ اعظمؒ کا حسنِ کردار جس سے متاثر ہو کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن جیسے کینہ پرور دشمن کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ

جناحؒ کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت۔ اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اتر سکو۔ نہایت ذہین و فطین۔ وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور میں ان کے جواب کے لئے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرک پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔

اس نے (بی۔ بی۔ سی) کے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ مسٹر جناحؒ پاکستان کو ایک مسلم سٹیٹ کی شکل میں متشکل کرنے کے لئے دیوانہ تھا۔ (پاکستان ٹائمز ۱۲ نومبر ۱۹۸۰ء)۔

انگریز کے خلاف

جن لوگوں کے دل میں تحریکِ پاکستان کے خلاف خبثِ باطن اور قائدِ اعظمؒ کے خلاف، آتشِ انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر، منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ ہند، انگریزوں کی سکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔ اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے

واضح ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح للکارا، اور کس طرح ہر موقع پر ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہوگئے، جب انہوں نے سنہ ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑ دو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر، ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برملا کہا کہ

> اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا۔ اس ظالمانہ اقدام سے برِصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھینچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائدِ اعظمؒ کے خلاف یہ الزام عائد کر دیا کہ

> مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناحؒ صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

تو انہوں نے کھٹ سے جواب دیا کہ

> یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے۔

قائدِ اعظمؒ تو یہ کہہ رہے تھے، اور مسٹر گاندھی جو قائدِ اعظمؒ کے خلاف اس قسم کے الزامات تراشتے رہتے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء کے جریدہ "اسٹیٹسمین" میں برطانوی سامراج کے علیٰ حالہٖ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ

> تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولانگاہ بنا لیں گے ..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ مخمصہ ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست برد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود ہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا۔ اس کے برعکس قائدِ اعظمؒ

لندن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومتِ برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ

میں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سامنے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے بنا بریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں، ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔

۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا جس میں انتہائی پُر جلال انداز میں کہا کہ

میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ

مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہتر ثابت ہو سکے گا، اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے، اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس موضوع پر میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا، لیکن قلتِ گنجائش اس کی مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے خبثِ باطن کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہو گئی ہو گی کہ تقسیم ہند کی سکیم برطانیہ کی تخلیق تھی، اور قائدِ اعظم اس کے آلۂ کار بن کر کٹھ پتلی کا رول ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان شہادات میں اگر کسی

اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ تقسیم ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۷۵ء کے اواخر میں بی۔ بی سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈکاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے سوال کیا گیا کہ

کیا اس وقت، ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:-

> میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اُسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، تو چاہتے تھے کہ اُسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناح ؒ۔ صدر مسلم لیگ۔ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں، اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

قائد اعظم ؒ کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ چومکھی لڑائی اس انداز سے لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ گھیراؤ کے فسادات برپا کئے۔ نہ شورشیں اٹھائیں، نہ اینٹ پتھر برسائے۔ صرف اپنے تدبّر، فراست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت لی کہ تاریخ اس پر آج تک انگشت بدنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، البتہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، ۱۹۴۷ء میں کراچی کلب میں انہوں نے اپنی محترمہ بہن، مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ

> جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے، تو میری بہن ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکرات، پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے، میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپرواہی سے کام نہیں لیا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا۔

ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ کہ موت تک کے مقابلہ کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔ (فاطمہ جناح۔ "میرا بھائی" بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۲۰)

جب ۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظمؒ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بمبئی کے مشہور کانگریسی ہفتہ وار اخبار بلٹز نے لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناحؒ کی لیڈرشپ (قیادت) کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ لیگ نے پچھلے ہفتے جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بے ساختہ یہ آرزو ابھرتی ہے کہ کاش! انڈین نیشنل کانگریس میں، جناحؒ جیسے مسلّم الثبوت تدبّر کا ماہر کوئی ایک لیڈر ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناحؒ کے اس فیصلے نے، انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس عامیانہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلم لیگ، برطانوی استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔

(اصفہانی۔ ص ۱۸۸)

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں اس راز کو منکشف کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ایسے وقت بھی آئے تھے جب ہر آن ان کی گرفتاری کا امکان تھا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی بہن، محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جاں نثارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے افشا کیا۔ لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی انہوں نے، کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس میں اقربا نوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اقربا نوازی کا ایک موقعہ ان کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمشیرہ، محترمہ شیریں بائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

جب مرحوم چندریگر نے قائدِ اعظمؒ کے لائق بھانجے، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائدِ اعظمؒ کو پیش کی تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی "نا اہلیت" یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔

(جنگ کراچی۔ ۹ جولائی ۱۹۷۲ء۔ بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائدِ اعظمؒ کے حسنِ کردار ہی کا نہیں، دور نگہی اور مآل اندیشی کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ "اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے، لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر بھروسہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر

یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے۔ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ (بس یہ ہے ہمارا ساز و یراق اور اسلحہ اور فوج)۔

(عربک کالج۔ دہلی ۱۹۴۲ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس ساز و سامان کے ساتھ لڑنے والا قائد، کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائدِ اعظمؒ کے اپنے الفاظ میں، اخلاقی قوت، جرأت، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

لیکن ان چار میں ایک اور جزو کو بھی شامل کرنا چاہیئے اور وہ ہے خونِ جگر جس کے بغیر اقبالؒ کے الفاظ میں، ہر نقش ناتمام رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبالؒ میں تو خونِ جگر ــــ کے الفاظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن قائدِ اعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی تھی۔

قائدِ اعظمؒ کی صحت

یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دل سوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کر سکوں گا۔ آپ بھی دل تھام کر سنیئے۔ قائدِ اعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آ رہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا بیان ہے کہ

ہم ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے قائدِ اعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائدِ اعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اچانک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنا شروع کر دی جیسا کہ کسی آدمی کو گرم لوہے کی سلاخ سے چھوا جائے۔ میں اسی لمحے ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ دریافت کی اور قائدِ اعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے دردزدہ جگہ کی نشان دہی کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے دردزدہ جگہ کو ہاتھ لگایا تو نا امید ہو کر اگلے سٹیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرم مالش دینے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کروایا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو میں نے گارڈ کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ نیپکن میں لپیٹ کر بوتل کو ماؤف جگہ پر رکھا جس سے درد میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔

(میرا بھائی۔ ص۴)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائدِ اعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس

کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دُور تھی تو قائدِاعظمؒ اپنی نشست سے اُٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کے لکڑی سے بنے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی۔ قائدِاعظمؒ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تکان اور کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر قائدؒ میرے کندھوں کا سہارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے گاڑی سٹیشن پر پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائدِاعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور زور سے چلّا کر کہا کہ زیادہ شور نہ کریں کیوں کہ قائدِاعظمؒ تکان اور بخار کی وجہ سے بستر پر ہیں۔ دوڑ کر ڈاکٹر لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا نبض گر گئی تھی۔ (میرا بھائی۔ صـ۴)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائداعظمؒ آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ سُنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج اپنی بقا اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو! (میرا بھائی۔ صـ۱۳)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصد پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا ——— بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدت اور تن دہی کے ساتھ۔ لیکن یہ قوتِ ارادی، فطرت کے اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخر کار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس قدائے ملت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا ——— حتیٰ کہ اس میں اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتمد علیہ رازداں، بہن کو بھی شریک نہ کیا۔ یہ راز، راز ہی رہتا اگر اسے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشا نہ کرتے۔ یہ ڈائری ۱۹۷۵ء میں (فریڈم ایٹ مڈنائٹ) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تیزی سے گرتی جانے والی صحت کے متعلق قائدِاعظمؒ نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے "ایکس رے" لے کر کہا کہ "آپ کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح دِق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے"۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائدِاعظمؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکس رے کو کسی کے سامنے آنا چاہیئے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکس رے کی وہ فلم بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی سِل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سربمہر رکھنے سے مقصد کیا تھا، اسے اسی کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربمہر راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیمِ ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

ناقابلِ خرید

اس مردِ مجاہد نے، اس "حادثہ" کو سربمہر رکھنے کے لئے، اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا یہ خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم اہلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دُنیا سے چلا گیا۔ ان کی وفات پر، دنیا بھر کے عظیم مشاہیر نے (جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے) انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گل ہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد اہمیت کی حامل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ ان کی عظمتِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

> مَیں بڑی مدت سے مسٹر جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے، لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی سکیم پیش کی گئی تو قائدِ اعظمؒ نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ سکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِ اعظمؒ کو ہمنوا بنانے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ

> اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اپنی جگہ بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر رمزے میکڈانلڈ بے حد متعجب ہوا اور قائدِ اعظمؒ سے الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ، یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہے؟ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

> اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان - ۲۶ شمارہ ۱۶)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیشکش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیشکش کی گئی۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد، تقسیمِ ہند کی سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے بزرگ ترین لیڈر، مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ

> اگر ملکِ معظم کی حکومت ایک نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پہ آمادہ ہو تو میں کانگریسی رفقاء کو اس پہ

راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیرِ اعظم نامزد کر دے اور اسے قومی حکومت متشکل کرنے کا موقع دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناحؒ کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ اسے بجا طور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔ (طلوعِ اسلام - جون ۱۹۷۶ء)

قائداعظمؒ نے اسمبلی کی تقریر میں اس کا جواب یوں دیا:-

اگر مسٹر ایمرے (یعنی نمائندہ حکومتِ برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیش کش کی ہوتی تو کیا یہ اس وقت بھی میری طرف سے اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ مسٹر ایمرے اور راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں۔

اور اس تقریر کے آخر میں، یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا کہ

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے۔ ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ جمہوری نظامِ حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر ہم اس کا تہیہ کر لیں تو قلتِ تعداد کے باوجود، ہم تمہارے لئے اس سے سو گنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگرس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں، بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔

لارڈ ریڈنگ سے میکڈانلڈ کو جو جواب ملا تھا وہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔ اب یہ سنیئے کہ ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ لن لتھگو کے ساتھ کیا بیتی تھی۔ واضح رہے کہ لارڈ لن لتھگو، اپنے رعب و داب اور دبدبہ و طنطنہ کے لئے مشہور تھا۔ بات یوں ہوئی کہ وائسرائے نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی زعماء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ قائداعظمؒ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائداعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا، لیکن قائداعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاددہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسریگل لاج نہ پہنچے۔ وہاں جا کر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں" کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب ——— (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:-

یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں، مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے

منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔ (ص ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۱۲ر جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ

یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

(۰)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ایسا کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے قائدِ اعظمؒ کی سیرت کا بنظرِ تعمق مطالعہ کیا ہے نہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے کس قدر خلاف تھی۔ ایک واقعہ سنیئے جسے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری (سید مطلوب حسن صاحب) نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے:-

ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائدِ اعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائدِ اعظمؒ نے یہی سوال اس کپتان پر دُہرایا۔ اُس نے کہا کہ بے شک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے پوچھا کہ تم کس بنا پر ایسا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بنا پر کہ ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس کی طرف غصہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہو گے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

(نوائے وقت - ۴ر جنوری ۱۹۷۷ء)

بات واضح تھی کہ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا۔ اور ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اُس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے، قائدِ اعظمؒ کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی عظیم ذمہ داری اُس کے سپرد کی جائے۔

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنے تمام رفقاء کے مقابلے میں قائدِ اعظمؒ کا مقام کس قدر بلند تھا لیکن اس کے باوجود اُن کے دل میں مخلص کارکنوں کا کس قدر احترام تھا، اُس کے متعلق اصفہانی صاحب کی زبان سے سنیئے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

رفقاء کا احترام

یہ اُس شام کا واقعہ ہے جب ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اور راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر جناحؒ اور مس فاطمہ جناحؒ کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے قائدِ اعظمؒ سے اجازت چاہی تاکہ ہم ان کے سیشن میں پہنچنے سے پہلے مجلس عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہتے، انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جائیے۔ ہم اکٹھے سیشن میں

جائیں گے۔ ہمارے لئے یہ فرمان بڑا تعجب انگیز تھا۔ لیکن ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں پنڈال میں پہنچے، اور میں اور راجہ صاحب دروازے پر ٹھہر گئے تاکہ قائدِ اعظمؒ اور ان کی ہمشیرہ آگے تشریف لے جائیں اور ہم پنڈال میں اُن کے بعد پہنچیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قائدِ اعظمؒ آگے نہ بڑھے اور ہم سے کہا کہ ہم چاروں بدوش ایک ہی لائن میں پنڈال میں داخل ہوں گے۔ ہم لاکھوں کے مجمع میں اس طرح چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ انہوں نے انتہائی مسرت کے لہجے میں کہا۔ "میرے عزیزو! کیا تم اس منظر کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم نہیں اٹھے؟ اس لاکھوں کے مجمع کو دیکھو اور پھر سوچو کہ ہم نے تھوڑے سے وقت میں اتنی لمبی مسافت طے کر لی ہے۔ میں آج آپ کو ساتھ لے کر اس لئے پنڈال میں داخل ہوا ہوں کہ میں اُس احترام کا اظہار کر سکوں جو آپ کا میرے دل میں ہے اور ان لاکھوں ناظرین کو دکھا سکوں کہ میں پُر خلوص خدمات کی اتنی قدر کرتا ہوں۔ (صفحات ۱۰۸-۱۰۷)

سوچئے کہ کیا ڈکٹیٹروں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے؟

امیر المؤمنین

مسٹر اصفہانی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

ایک دفعہ اُن کے بعض مداحوں نے جوشِ عقیدت میں انہیں امیر المؤمنین کہہ کر پکارا۔ انہوں نے فوراً روک دیا اور کہا کہ میں امیر المومنین نہیں ہوں۔ میری تعریف میں حد سے مت بڑھو۔ (صـ۱۱۷)

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ قائدِ اعظمؒ کو جس قدر گہرا تعلق تھا اور وہاں کے طلبا کے دل میں ان کا احترام جس قدر تھا اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سنہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ان کے پاس اس احترام اور عظمت کے پیشِ نظر اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری کی پیش کش کی لیکن قائدِ اعظمؒ نے اسے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں مسٹر جناحؒ ہی اچھا ہوں، آپ کا شکریہ!

(قائدِ اعظمؒ کی خطوکتابت مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ۔ صـ۲۰۹)

(۰)

عام تاثر یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ خالصتاً اس قسم کے قانون دان اور ان خشک مزاج انسانوں میں سے تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی شخصیت علامہ اقبالؒ کے اس مثالی کردار کی زندہ پیکر تھی، جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے!

حسِ لطیف

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم اور پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انسان

جذباتِ لطیف سے عاری ہو وہ انسان نہیں، حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ حسِ مزاح اسی ذوقِ لطیف کی مظہر ہوتی ہے اور قائدِ اعظمؒ کو اس کا بہرۂ وافر عطا ہوا تھا، اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ مزاح اور استہزا میں فرق کرنا جانتے تھے۔ اُن کا نشتر ٹھیک ٹھکانے پر لگتا جس سے ان کے ہدف کی کیفیت یہ ہو جاتی کہ ——— جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور ——— اور جب اُن کا ہدف گاندھی جیسا مکار حریف ہوتا تو اس طنز کی شوخی رنگین تر ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام مہاتما جی شیوگاؤں میں اپنی کٹیا میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بڑا سا سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد چکر لگایا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے مہاتما جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائدِ اعظمؒ کے پاس آئے۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہے؟ آپ نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقع صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے؟ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ پھر سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک توجیہ کیا ہے؟ فرمایا (PROFESSIONAL ETIQUETTE) یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جا سکتا ہے، تشریح نہیں کی جا سکتی۔ تشریح کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیا جائے۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے۔ "مہاتما گاندھی" پر اس سے کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تھی اس مردِ آہن کی حسِ لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

(۰)

اب ہم زندگی کی اس شاہراہ کی طرف آتے ہیں جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں وہ گھاٹیاں آتی ہیں جن پر بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے تھے لیکن قائدِ اعظمؒ اس دشوار گزار اور پُرخطر راستے سے بھی پاکیزہ پا گزر گئے۔ اس راستے کا تعلق جنسیات سے ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی پہلی شادی، ان کے والدین نے ان کے بچپن کے زمانے میں کر دی تھی اور وہ بیوی بھی جلد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ۴۰ سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ان کا یہ تمام عہدِ شباب، سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ گزرا، درآنحالیکہ دولت، شہرت، قابلیت کے لحاظ سے بھی ان کا شمار ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا اور اس کے علاوہ مردانہ حسن و رعنائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کا ایک ممتاز ترین اور متمول ترین خاندان تھا جس کے سربراہ "سر ڈنشا پٹیٹ" کی اکلوتی لڑکی رتن بائی، حسنِ سیرت و صورت میں بے مثال تھی۔ یہ دونوں شادی پر رضامند ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ سر ڈنشا، ایک مسلمان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے؟ لیکن بیٹی کے اصرار پر انہیں بالآخر رضامند ہونا پڑا۔ معاملہ یوں طے پا گیا تو "مسٹر جناح" نے یہ شرط عائد کر دی کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، تب شادی ہو سکے گی۔ اس پر سر ڈنشا کے خاندان میں کہرام

چ گیا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس شرط پر اصرار سے یہ رشتہ استوار نہیں ہو سکے گا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے "لو میرج" سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ شادی (سول میرج) کے طریق سے بھی انجام پا سکتی تھی لیکن مسٹر جناحؒ اپنی شرط پر قائم رہے اور شادی نہیں کی جب تک مس رتن بائی نے اسلام قبول نہیں کر لیا، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مسٹر جناحؒ قائدِ اعظم نہیں بنے تھے۔ فقط مسٹر جناحؒ تھے۔

یہی وہ شادی تھی جس کے خلاف ہمارے ہاں کے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کے مدعیوں نے یہ افتراء پھیلایا تھا کہ ؎

ایک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائدِ اعظمؒ ہے کہ کافرِ اعظم

اس رفیقۂ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں اور بھی کئی عناصر کارفرما ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حق گوئی اور بیباکی کی وہ خصوصیت تھی جو خود قائدِ اعظمؒ کے کردار کا بنیادی حصّہ تھی۔ اُس کی شہادت ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے۔

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر اور مسز جناحؒ اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ ریڈنگ) کے ساتھ لنچ تناول فرما رہے تھے۔ دورانِ گفتگو وائسرائے نے مسز جناح سے کہا کہ وہ جرمنی جانا چاہتے ہیں لیکن ایسا کر نہیں سکتے۔ مسز جناح نے کہا کہ کیوں؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہاں کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس پر مسز جناح نے کھٹ سے کہا کہ "پھر آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے ہیں"؟ (ڈان کراچی ۷۶/۱۱/۲۸) غور فرمائیے کہ کیا یہ خود مسٹر جناح کی صدائے بازگشت نہیں؟

سحرِ فرنگ

مسز جناح ۱۹۲۹ء میں وفات پا گئیں اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے بقیہ ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ اس دوران میں انہیں کس کس قسم کی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، اس کی ایک مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ تقسیمِ ہند کی گتھی سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی ایڈوینا بھی تھی۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ "محترمہ" کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے اور یہی تھے وہ ریشمیں جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا اگر رچرڈ ہوگ کی مرتب کردہ، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگرنی کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:۔

اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا مسئلہ تقسیمِ ہند کی گفت و شنید کے لئے جو (انگریز) اربابِ حل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اس میں سرِ فہرست ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اوّلین ہدف جواہر لال نہرو تھا۔ وہ مجرّد

تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ (ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پالیا) یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً برا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔

حتیٰ کہ گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا۔۔۔ اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت، نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔

آپ اس جادوگرنی کے "حصار" سے باہر نکل آئیے اور فخر و مباہات سے (HOUGH) کے اس اعتراف کو پڑھیئے کہ "اس سارے ہجوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا ہو تو وہ قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ تھا"۔ اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ ٹیلر نے (جو کسی زمانے میں وزیر ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ

> ماؤنٹ بیٹن جناحؒ کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لئے تھے۔ جناحؒ اسے کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہمیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہیئے تھا کیونکہ) جناحؒ وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناح کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا، لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناحؒ میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام۔ تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجالس میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر، محض اس کی آمد سے تمام شرکائے محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا۔۔۔ اپنے اصولوں کا پکا۔ قطعاً نہ جھکنے والا۔ اس سے بات کرنا آسان کام نہ تھا (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

(۰)

آخر میں چند الفاظ اس اعتراض کی تردید میں کہ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ "قائدِ اعظمؒ" اور "معاشی مسئلہ" ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی صرف دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں جنگِ پاکستان اپنی انتہائی شدت پر پہنچ چکی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس وقت بڑے بڑے متمول شرکاء کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے صدارتی خطاب کے دوران قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:۔

سرمایہ دار اور جاگیردار

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔

انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لئے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں دردانگیز مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

(۰)

آخر میں، میں اسے ایک نہایت حسین اور دلآویز مقطع پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے کردار میں کندن کی سی صلابت اور ہیرے کی سی درخشندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس نے (شعوری یا غیر شعوری طور پر) سیرتِ محمدیہ کی شمعِ نورانی سے کسبِ ضیا نہ کیا ہو۔ قائدِ اعظمؒ کی سیرت کی تابندگی بھی اُس کی رہینِ منت تھی۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اُن کی شیفتگی کا کیا عالم تھا۔ اس کی مثال ہمیں اس زمانے میں ملتی ہے جب ان کی عمر ہنوز سولہ سال کی تھی۔ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے تو سوال یہ سامنے آیا کہ وہ کس درس گاہ میں داخلہ لیں۔ انہوں نے ۱۹۴۶ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

میں نے بالآخر "لنکنز ان" میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بڑے دروازے پر دنیا کے ممتاز ترین مقننین کی جو فہرست کندہ تھی اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی بھی شامل تھا۔

(ہیکٹر بولیتھو)

حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلسِ دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ناصحانہ انداز میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے روا رکھا تھا۔ یہ سن کر قائدِ اعظمؒ نے جھٹ سے جواب دیا کہ

غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے لئے ہمیں کسی اکبر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہمارے سامنے ہمارے رسولِ مقبول ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے جنہوں نے عیسائی اور یہودی اقلیتوں سے ایسی کشادہ ظرفی کا برتاؤ کیا تھا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملے گی۔ ہم اس رسول ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں گے۔

وہ رسولِ مقبول ﷺ جن کی شان میں کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی جشنِ میلاد النبی ﷺ کی تقریب میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کی عزت و تکریم کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین۔ انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز ایسی عظیم بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا، اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسولِ اکرم ﷺ عظیم مصلح تھے۔ عظیم ترین رہنما تھے۔ عظیم واضعِ قوانین تھے۔ عظیم سیاستدان تھے۔ عظیم حکمران تھے (صلے اللہ علیہ وسلم)۔

(٥)

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ کی اُس عظمتِ کردار اور رعنائی سیرت کی چند جھلکیاں، جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں چومکھی لڑائی لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی۔ تاریخِ عالم کا یہ، یقیناً ایک منفرد واقعہ ہے۔ طاب لہٗ حسن مآب۔ شادابیوں اور کامرانیوں کی اس قسم کی پُر مسرت داستان کے بعد، میں آپ کی آنکھوں کو غم کے آنسوؤں سے نم آلود نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ؎

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج؟
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ راز نہ ہو

مجھے جب بھی، حالاتِ مابعد کے تناظر میں اُن حسین خوابوں کی یاد آتی ہے، تو دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آ جاتا ہے کہ ؎

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں!
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے!

پرویز

(٥)

مصنف کی شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آسکتا ہے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۴۰ روپے
مکمل سیٹ -/۱۵۰ روپے

تبویب القرآن

آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآن مجید میں کیا اور کہاں کہاں آیا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

اس کتاب میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں اور ہر عنوان کے تحت اُن قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ کہا گیا ہے۔ مصنف کی چالیس سالہ تحقیق کا ماحصل ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۵۱۲ صفحات پر مشتمل ہے عمدہ سفید کاغذ، اوفسٹ کی چھپائی، تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ قیمت:- مکمل سیٹ -/۱۷۵ روپے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ جلد -/۱۵۰ روپے

مطالب الفرقان

پرویز صاحب کے درسِ قرآن مجید کا سلسلہ گزشتہ بیس سال سے جاری ہے۔ اس میں ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت کے محاورۂ عرب اور تصریف آیاتِ قرآنی سے آیاتِ قرآنی کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق مسلسل تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ان دروس کی بنیاد پر قرآن کریم کی تفسیر مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کا نام مطالب الفرقان ہے۔ ابھی تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں۔
عمدہ سفید کاغذ، پاکیزہ اوفسٹ چھپائی۔
قیمت:- جلد اوّل -/۵۰ روپے، جلد دوم -/۵۰ روپے، جلد سوم -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی/۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور